سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نمبر ۱۸۴

مانڈو
شادی آباد

از

جناب غلام یزدانی صاحب

مترجمہ

میرزا محمد بشیر

شائع کردہ

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند)، دہلی

سنہ ۱۹۴۲ء

قیمت مجلد ے غیر مجلد عہ

عنوان

مفید عام پریس لاہور میں باہتمام لالہ موتی رام مینیجر چھپی
اور سید صلاح الدین جمالی مینیجر انجمن ترقی اُردو (ہند) نے دہلی سے شائع کی

فہرست مضامین

مانڈو

(شادی آباد)

از

جناب غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے

ناظم محکمۂ آثارِ قدیمہ۔ حیدر آباد دکن

ماہر کتبات اسلامی برائے حکومتِ ہند

مترجمہ

میرزا محمد بشیر۔ ایم۔ اے

مانڈو

(شادی آباد)

دیدم چغدے نشستہ در صبح وپگاہ
بر کنگرۂ مقبرۂ نوشیرواں شاہ
فریاد کناں ز روے عبرت می گفت
کو آں ہمہ حشمت و مال و جاہ

(کتبۂ اکبر در مانڈو)

"عرض مترجم"

شب مالوہ تو آج بھی مشہور ہے لیکن شاہانِ مالوہ اور ان کے قدیم دار السلطنت مانڈو کی عظیم الشان عمارتوں کو اب دنیا فراموش کرتی جاتی ہے۔ جناب غلام یزدانی[1] صاحب نے اس کی عظمتِ رفتہ کا نقشہ اور قدیم عمارتوں کے حالات کا مرقع اپنی معرکہ آرا انگریزی تصنیف "مانڈو۔ دی سٹی آف جوائے" میں پیش کیا ہے۔ میں مصنّف موصوف کا بیحد ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ کو اپنی اس گراں قدر تصنیف کے ترجمے کی اجازت بخشی۔

ہندستان کا یہ تاریخی شہر برباد و ویراں ہو چکا مگر اس کی قدیم عمارتیں جو بقولِ مصنّف ہندستانی فنِ تعمیر کا جگمگاتا ہوا ہیرا ہیں" ابھی باقی ہیں۔ اب اُردو میں غرناطہ و قرطبہ، دہلی و آگرہ کی عمارتوں کا ذکر بہت پائیں گے۔ مگر اس اجڑے دیار کے "ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں" کا حال بہت کم دیکھیں گے۔ مانڈو آپ کے اس طرزِ تغافل کا شکوہ سنج ہے ؎

خندند ہمہ بر دلِ دیوانۂ ما | تا کے گوئی بچرخ شد خانۂ ما
زاں پیش کہ بشنوند افسانۂ ما | زافسانۂ دیگراں بیا عبرت گیر

(از کتبۂ اکبر۔ ۱۰۰۸ھ)

مجھے امید ہے کہ یہ ترجمہ اس تاریخی مقام اور اس کی عمارتوں کے متعلق اردو دانوں کی معلومات میں اضافہ کرے گا۔

---

[1] ناظم محکمۂ آثار قدیمہ۔ حیدرآباد دکن

کتاب کے اول دو بابوں میں جغرافی و تاریخی حالات ہیں جن میں مصنف نے دل کشی و دلاویزی کو قائم رکھتے ہوئے علمی تحقیق و تدقیق کا حق ادا کیا ہے۔

تیسرے باب میں عمارتوں کا مفصل حال ہے جن میں ان کی فنی خوبیاں اور کمزوریاں ظاہر کی گئی ہیں اور فنِ تعمیر کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔

ترجمے کے متعلق یہ عرض کرنا ہے کہ بعض اقتباسات کا ترجمہ کرتے وقت اصل فارسی کتب مثلاً فرشتہ، تزکِ جہانگیری وغیرہ سے مدد لی گئی ہے۔ اس کام میں اردو ڈکشنری، مرتبہ ڈاکٹر عبدالحق۔ بہت کارآمد ثابت ہوئی۔

میرزا محمد بشیر

مھو کینٹ
۶ ستمبر ۱۹۴۱ء

دیباچہ مؤلف

مانڈو کی رومانی تاریخ اور اس کی خوب صورت قدیم عمارتوں کے افسانے مجھے ہمیشہ اپنا گرویدہ بناتے رہے اور میں اکثر شادی آباد کے خواب دیکھا کرتا جہاں سلطان غیاث الدین کی خدمت میں ۱۵۰۰۰ مہ وشیں دست بستہ حاضر رہتیں اور جہاں من چلے باز بہادر کو روپ متی کی دلربا اور دل کش آواز نے موہ لیا تھا۔ میرے خواب کچھ اس طرح سچ ہوئے کہ مجھ کو اس کا سان گمان نہ تھا۔ ہز ہائینس مہاراجہ دھار کو جن کی ریاست میں مانڈو واقع ہے میری اُس دل چسپی کا حال معلوم ہوا جو مجھے آثارِ قدیمہ سے ہے اور یہ ان کی عنایت تھی کہ انھوں نے مجھ کو اپنی ریاست میں آنے کی دعوت دی اور خیر مقدم کا یقین دلایا۔ اعلیٰحضرت حضورِ نظام نے بہ عنایتِ خسروانہ مجھ کو اس دعوت سے مستفید ہونے کی اجازت بخشی اور مانڈو میں میرا قیام بطور میرے فرضِ منصبی کے سمجھا گیا۔ یہ واقعہ تھا ۱۹۲۵ء کا لیکن اس کے بعد فوراً ہی مہاراجہ دھار کی علالت اور بعد ازاں وفات کی خبر آئی اور اس طرح مجھے اس حکمران کو دیکھنے کا فخر نہ حاصل ہو سکا جس نے مانڈو میں مجھ کو مدعو کیا تھا اور جس کا نام وسطِ ہند میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔

لیکن دھار دربار کو میری آمد سے دل چسپی قائم رہی اور میں جب مارچ ۱۹۲۶ء میں وہاں پہنچا تو دیوان راؤ بہادر، کے۔ ناڈکرنے نہ صرف ہماری جماعت کے آرام کا انتظام کیا بلکہ خاص خاص عمارتوں کے نقشے تیار کرنے کے لیے ایک نقشہ نویس کی خدمات پیش کیں۔ آخر میں دھار ریاست نے

بخوشی یہ تجویز پیش کی کہ میرے نتائجِ مطالعہ خود ان کے صرفے سے 'رہنما' کی صورت میں شایع کیے جائیں۔ لہٰذا میں خلوصِ دل سے دھار دربار کی مہمان نوازی و تواضع ہی کا نہیں بلکہ اس عنایت کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے میرے نتائجِ مطالعہ کو موجودہ شکل میں شایع کرنے کا موقع بخشا۔

اس کتاب کے مقصد کے متعلق میں یہ توضیح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ عام سیاح کے لیے لکھی گئی ہے اور ممکن ہے کہ اس میں تفاصیل کی کمی نظر آئے جو اس مخصوص موضوع کی کسی زیادہ ضخیم کتاب میں درج کی جا سکتی ہیں۔ پھر بھی ناظرین کی خدمت میں قدیم عمارتوں کا واضح حال بیان کرنے میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی گئی ہے اور اس مقصد کے لیے بہت سی عکسی تصاویر اور خاکے اس کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔

اس سے پیشتر جو کتابیں مانڈو کے متعلق شایع ہوئی ہیں اُن میں سے دو خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اُن میں سے ایک نہایت فاضلانہ مضمون مُصنّفہ مسٹر (بعد کو سر ہوئے) جے۔ ایم۔ کیمبل[1] ہے جنھوں نے مانڈو کی اسلامی تاریخ نہایت احتیاط سے لکھی ہے اور اس موضوع[2] سے جن لوگوں کو دلچسپی ہے وہ اس کے مطالعے سے مستفید ہوں گے۔ دوسری کتاب "تاریخِ مانڈو، مالوے کا قدیم دار السلطنت" از 'اے بومبے سب آلٹرن'[3] ہے۔ مصنف نے اپنے مانڈو کے سفر

---

[1] رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی بمبئی شاخ کے رسالے میں شایع ہوا۔ جلد ۲۹ از ۱۵۶ تا ۲۰۱۔ ۱۸۹۵ء تا ۱۸۹۷ء۔

[2] کتبوں کے تراجم جو اس مضمون میں موجود ہیں بہت سے صحیح نہیں ہیں۔ ان کے لیے ناظرین کو ہندستانی اسلامی کتبات دیکھنا چاہیے ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۲ء۔

[3] اصل میں یہ شایع ۱۸۵۵ء میں ہوئی اور بمبئی میں اس کی دوبارہ اشاعت ۱۸۷۵ء میں ہوئی۔

کے متعلق نہایت ہی شگفتہ حالات تحریر کیے ہیں اور مانڈو کے سلسلے میں اس کو فراموش کرنا اتنا ہی مشکل ہی جتنا واشنگٹن اِروِن کو الحمرا میں۔

آخر میں حکومتِ ہند کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کے اس کام کی میں مدح کرنا چاہتا ہوں جو اس نے مانڈو میں کیا ہی اور جس کی توجہ اور خبرگیری ان قدیم عماتوں کے تحفظ کا بڑا باعث ہوئی۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ دھار دربار نے اس محکمے کی اُن تجاویز پر جو اس نے جنگل کی صفائی اور عمارت کی مرمت سے متعلق کیں عمل کرنے میں کسی کوشش یا صرفے سے دریغ نہیں کیا۔

ختم کرنے سے پیشتر، مجھے یہ عرض کرنا ہی کہ میں مسٹر جان جونسن، مطبعِ اکسفورڈ یونیورسٹی کے مطابع کا ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کی طباعت میں اپنی دلی اعانت اور فنی مشوروں سے مدد دی۔

جی۔ یزدانی

حیدرآباد دکن
پہلی مئی ۱۹۲۸ء

باب اوّل

طبعی حالات اور مقامی جغرافیہ

چند ہی قلعوں کو مانڈو کی سی جگہ نصیب ہوئی۔ یہ سلسلۂ وندھیاچل کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع ہے جس کی بلندی سطح آب سے ۲۰۷۹ فٹ ہے اس چوٹی اور مالوے کی سطح مرتفع کے درمیان ایک گہرا نالہ حائل ہے جس میں بلند درختوں کا جنگل ہے وہ دل کش گھاٹی جس کو عجیب و غریب پیچ و خم کی بنا پر کیکڑا کوہ کہتے ہیں۔ مانڈو کی پہاڑی کو تین طرف سے گھیرتی ہوئی آخر نیماڑ کے میدان سے مل جاتی ہے جو قلعے کے جنوب میں ۱۲۰۰ فٹ نیچے واقع ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر خاصا ہموار میدان ہے باستثنار چند ٹیلوں کے جن میں سون گرھ کا نکلا ہوا حصہ نہایت نمایاں ہے۔ یہ پہاڑی شمال سے جنوب تک تین چار میل پھیلی ہوئی ہے اور مشرق سے مغرب تک چار پانچ میل اس کا رقبہ ۱۲۰۰۰ انگریزی ایکڑ [ا] سے کچھ زیادہ ہے

[ا] سرجے۔ ایم کیمپبل لکھتے ہیں "پندرھویں صدی کے عہدِ عروج میں مانڈو کی پہاڑی کی چوٹی کا رقبہ ۱۲۰۰۰ ایکڑ تھا جس میں ۵۶۰ کھیت، ۳۷۰ باغات، ۴۰۰ کنویں، ۸۰۰ تالاب اور جھیلیں، ۱۰۰ بازار کی سڑکیں ۱۵۰۰ مکانات ۲۰۰ سرائیں ۳۶۰ حرام ۷۰۴ مسجدیں ۳۲۴ محلات تھے۔ ان عمارتوں کی کثرت کی وجہ سے جنگل کے لیے ۱۵۶ ایکڑ زمین بچ گئی تھی جس میں ٹیلے اور پہاڑیاں تھیں"

جے۔ بی۔ آر۔ اے۔ ایس جلد ۲۹ ص ۱۵۶

آب وہوا معتدل اور صحت بخش ہی اور بارش کے بعد سبزہ زار ایک ایسا نظارہ پیش کرتے ہیں کہ جن کے شکوہ حسن کا اظہار مشکل ہی۔ شہنشاہ جہانگیر اس مقام کے نظارے کا شیدائی تھا اور تزکِ جہانگیری میں یوں رقم طراز ہی "میرے الفاظ کیا بیان کر سکتے ہیں اس گھاس اور ان جنگلی پھولوں کے حسن کو؟ وہ ہر پہاڑی اور وادی، ہر نشیب و میدان پر چھائے ہوئے ہیں، میں کسی ایسی جگہ سے واقف نہیں جو مانڈو کی سی لطافتِ آب و ہوا اور برسات میں ایسے نظارے پیش کرتی ہو۔ اس جولائی کے مہینے میں جو گرمیوں کا مہینہ ہی سورج بُرجِ اسد میں ہوتا ہی۔ مگر یہاں کوئی شخص گھر کے اندر بغیر رضائی اوڑھے سو نہیں سکتا اور دن میں پنکھے کی ضرورت نہیں ہوتی جو کچھ میں نے بیان کیا وہ مانڈو کے محاسن کا صرف ایک حصہ ہی"۔ اس سطحِ مرتفع پر بہت سی جھیلیں اور کنڈ ہیں جن کے شفاف پانی میں کنارے کے آم، کھرنی، املی اور کیلے کے گھنے درختوں کا عکس پڑتا ہی۔ سیاح ان خوب صورت پیڑوں میں ملے جلے بوباب کے کم یاب درختوں کو ضرور دیکھے گا جن کے بڑے بڑے پھولے ہوئے تنوں میں اور بے پتوں کی شاخوں میں کدو کے قسم کے پھل[1] لٹکتے ہیں۔ ان میں پتیاں صرف برسات میں نکلتی ہیں۔ ان کا مقامی نام "خراسانی املی" ہی اور کہا جاتا ہی کہ مانڈو میں یہ درخت افریقہ سے لاکر محمود خلجی (۶۹-۱۴۳۶) کے عہد میں لگایا گیا۔ اس زمانے میں اس برِاعظم سے مالوہ کے بڑے تجارتی تعلقات تھے۔ ایک فرانسیسی ماہرِ نباتیات ایڈنسن جس نے اس درخت کا سراغ لگایا اس کا خیال تھا کہ

---

[1] ابو الفضل نے غلطی سے اس کو املی کا درخت سمجھا اور آئین اکبری میں لکھتے ہیں "یہاں املی ناریل کے برابر بڑی ہوتی ہی اور اس کا گودا بالکل سفید ہوتا ہی۔" ترجمہ جیرٹ جلد ۲- ص ۱۹۷-

دوسرے درختوں سے اس کی عمر زیادہ ہوتی ہے اس نے ایک بوباب دیکھا جس کا تنا قطر میں ۳۰ فٹ تھا اور اس کی عمر ۵۱۵۰ سال اندازہ کی۔

مانڈو کے جنگلی جانور بھی کچھ کم دل چسپ نہیں اور گو فی زمانہ شیروں کا وہ غلبہ نہیں رہا کہ "راہ چلتے سپاہیوں کو دستوں کی قطار سے اٹھالے جائیں"[۵] لیکن پھر بھی یہ جنگل کا بادشاہ قلعے کی سنسان وادیوں کا تنہا مالک ہے اور ہم اکثر سنتے ہیں کہ یہاں آجانے والے جانور اور انسانوں کو اپنی جسارت کی سخت سزا بھگتنی پڑی۔ تیندوے رات کو سڑکوں پر پہرا دیتے اور بھالو اکثر گشت لگاتے رہتے ہیں بے ضرر جانوروں میں مختلف قسم کے ہرن نظر آتے ہیں اور کھلنڈرے بندر تو ہر جگہ شاخوں پر کودتے پھاندتے اور کبھی کبھی آنے والوں کو بھپکیوں سے دھمکاتے ہیں شروع گرمیوں میں ہوا پرندوں کے شیریں نغموں سے گونج اٹھتی ہے ان پرندوں میں بعض کے پَر نہایت شاندار ہوتے ہیں۔

شہنشاہ جہانگیر اپنے دورانِ قیام میں ممولا جس کو فارسی میں 'دُم سیجہ' کہتے ہیں اس کا گھونسلا دیکھ کر بیحد محظوظ ہوا تھا۔ تزک میں لکھا ہے "اب تک شکاری اس کے گھونسلے کا پتا نہیں لگا سکے تھے۔ اتفاق سے میں جس عمارت میں مقیم تھا اسی میں اس کا (ممولے کا) گھونسلا تھا اور اس میں اس کے دو بچے تھے"[۶]!

یہاں کے کھنڈروں میں حشرات الارض بے شمار ہیں جس میں ایک قسم کی چھپکلی جس کو گوہیرا کہتے ہیں غضب کی زہریلی ہوتی ہے۔ اس کو معمولی نہ سمجھنا چاہیے۔ کالے ناگ بکثرت ملتے ہیں اور خود مصنف نے اپنے مختصر دورانِ قیام میں

---

[۵] فرشتہ۔ ترجمہ برگس جلد ۴ ص ۲۲۵

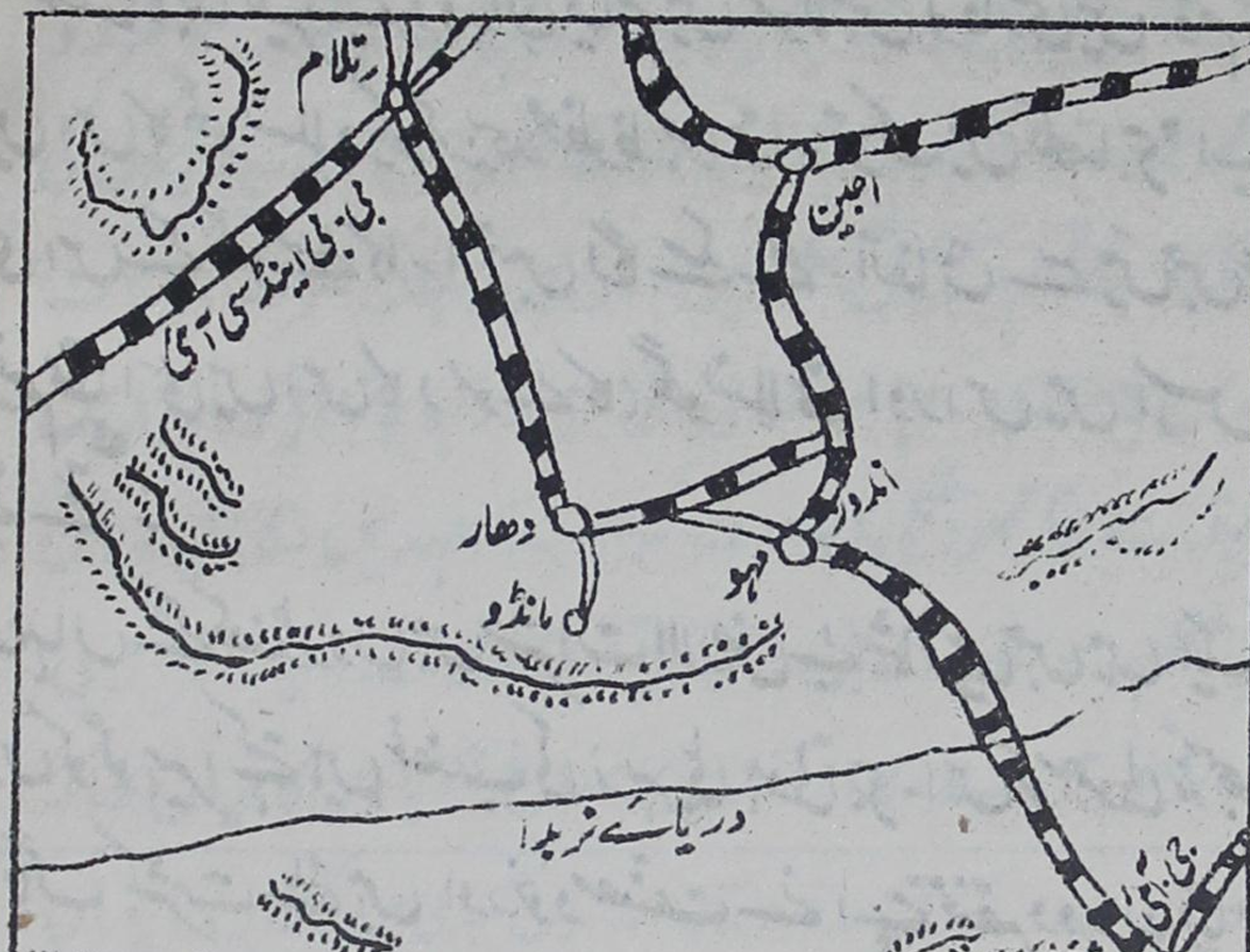
[۶] تزکِ جہانگیری از روجرس اور بیورج۔ جلد ۲۹ ص ۳۸۳ — ۴

دو دیکھے۔ ان میں سے ایک لال بنگلے میں مارا۔ یہ سانپ ۵ فٹ لمبا تھا اور تقریباً ڈیڑھ انچ موٹا۔

ماندو (۲۲° ۲۱′ شمالی عرض البلد اور ۵°، ۲۶′ مشرقی طول البلد) کا سب سے آسان راستہ دھار ہو کر ہی جو مہو[1] سے ۳۴ میل سیدھی سڑک سے ہے اور اندور سے ۳۰ میل۔ ماندو دھار سے ۲۲ میل جنوب میں ہے۔ سڑکیں موٹر کے لیے اچھی ہیں۔ لاریاں اندور اور دھار اور اسی طرح مہو اور دھار کے درمیان چلتی ہیں۔ سیاح مہو یا اندور کے ریلوے اسٹیشن سے ماندو کے لیے چھوٹی موٹر بھی کرایہ پر لے سکتا ہے۔

---

[1] مہو اور اندور بی۔ بی۔ سی۔ آئی ریلوے (چھوٹی لین) کے کھانڈوا اور اجمیر کے درمیان دو بڑے اسٹیشن ہیں۔ بمبئی سے جو مسافر مہو یا اندور آئیں ان کو کھانڈوا جنکشن (جی۔ آئی۔ پی۔ آر) پر گاڑی بدلنی چاہیے۔ بمبئی سے ایک دوسرا راستہ بی۔ بی اینڈ سی آئی (بڑی لین) (براڈ گیج) سے ہے۔ جو لوگ اس طرف سے سفر کریں ان کو چاہیے کہ رتلام میں اندور کے لیے گاڑی بدلیں۔



باب دوم

تاریخ

مانڈو کی تعمیر کے متعلق ابوالفضل نے ایک دل چسپ قصہ بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے "پنڈتوں کا عقیدہ ہے کہ اس ملک میں ایک ایسا پتھر دستیاب ہوتا ہے جس سے ہر نرم دھات چھو جانے سے سونا بن جاتی ہے۔ اس کو "پارس" کہتے ہیں۔ وہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ بکرماجیت کے عہد سے پیشتر ایک نہایت منصف مزاج راجا جے سنگھ دیو حکمراں تھا جس نے اپنی ساری زندگی نیک کاموں میں صرف کی۔ اسی زمانے میں ایسا پتھر دستیاب ہوا اور اس سے بڑی دولت ہاتھ لگی۔ ایک گھسیارے کی درانتی اس کے اثر سے سونے کی بن گئی وہ شخص یہ راز معلوم نہ کر سکا اور سمجھا کہ اس میں کچھ خرابی ہو گئی۔ وہ اس کو درست کرانے کے لیے ایک لوہار مانڈن کے پاس لے گیا۔ مانڈن اس کے خاصے کو تاڑ گیا اور اس پتھر کو لے کر بڑی دولت جمع کی پھر فطری نیک دلی سے اس نے سوچا کہ ایسا انمول خزانہ بادشاہِ وقت ہی کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ اس نے دربار میں جا کر اس کو بادشاہ کی نذر کر دیا۔ راجا نے اسے پا کر بہت سے نیک کام کیے اور اس دولت سے جو اس کے ذریعے سے حاصل کی تھی یہ قلعۂ مانڈو بارہ برس میں تیار کیا اور پتھر جو اس کی تعمیر میں لگے وہ اس لوہار کی التجا کے بموجب سندان کی شکل کے تراشے گئے۔ ایک دن راجا نے نربدا کے کنارے ایک جشن کیا اور اپنے

برہمن پجاری کو مالا مال کرنے کا وعدہ کیا۔ مہاراجا کا دل دنیا کے مال و دولت سے کچھ بیزار سا ہوگیا تھا اس لیے اس نے وہ پتھر برہمن کو بخش دیا۔ برہمن اپنی ناواقفیت و بدنفسی کی وجہ سے ناراض ہوگیا۔ اس نے اس انمول خزانے کو دریا میں پھینک دیا اور بعد ازاں زندگی بھر کفِ افسوس ملتا رہا۔ وہ دوبارہ اس کو دریا کی گہرائی کی وجہ سے حاصل نہ کرسکا۔ آج تک دریا کے اس حصے کی تھا نہیں ملتی[۱]"۔

شہنشاہ جہانگیر اپنی تزک میں اس واقعہ کو دہراتا ہے لیکن اس کا ناقد ذہن اس کو تسلیم کرنے سے قاصر ہے اس لیے وہ مختصراً لکھتا ہے "یہ سب مجھ کو حقیقت سے بعید معلوم ہوتا ہے[۲]" فرشتہ تعمیر مانڈو کا سہرا انند دیو کے سر باندھتا ہے۔ "انند دیو بیس خاندان کا راجپوت جو خسرو پرویز (۵۹۰ تا ۶۲۸) کا ہمعصر تھا، سولہ برس حکومت کرنے کے بعد مر گیا[۳]" آخر الذکر مورخ کے حالات بھی محض کہانیوں پر مبنی ہیں اس لیے اس کے بیانات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی لیکن حال میں جے ورم دیو کے عطیے[۴] کی ایک کندہ لوح مورخہ ۱۲۶۱ء ملی ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ "مانڈو" پنوار بادشاہوں کے آخری قلعوں میں سے ایک قلعہ تھا[۵]" اس آخری بیان کی تائید مانڈو کے ہندو آثارِ قدیمہ سے ہوتی ہے جو روایات اور طرزِ تعمیر کی بنا پر دسویں اور تیرھویں صدی[۶] کے درمیان کے معلوم

---

[۱] انگریزی ترجمہ از جیرٹ۔ جلد ۲ ص ۱۹۷، [۲] روگرس اور بیورج جلد ۱ ص ۳۶۴ — ۵۔

[۳] برگس جلد ۱ ص ۳۹۔ [۴] پنوار عہد کی سنسکرت کی کندہ لوحوں میں اس کا ذکر منڈپا درگا کے نام سے کیا گیا ہے۔ سالانہ رپوٹ، اے، ایس، آئی۔ ۴ — ۱۹۰۳ ص ۳۰

[۵] ایضاً۔ [۶] تالاب "منجا تلاؤ" ظاہراً مشہور پنوار راجا کے نام سے منسوب ہے جو دسویں صدی کے آخری زمانے میں حکمراں تھا۔ مزید براں لوہانی دروازے کے نزدیک مندر کے کھنڈر اور منڈوا محل کی چھت کے نقش و نگار دسویں صدی سے (بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۷ پر)

ہوتے ہیں اور یہی زمانہ مالوہ میں پنواروں کے عروج کا تھا۔ مانڈو جو اپنے غیر معمولی قدرتی دفاع کی بنا پر عہدِ قدیم سے ایک مستحکم قلعہ رہا ہے اس کی تاریخ پنواروں کے زمانے (آٹھویں سے تیرھویں صدی عیسوی تک) سے قبل پردۂ خفا میں ہے اور اس زمانے کے واقعات وحالات جو جمع کیے گئے ہیں وہ ایک مسلسل بیان کے لیے بہت کم ہیں۔

مسلمان تیرھویں صدی کے ربع دوم میں اس وقت ادھر آئے جب شمس الدین التمش نے مالوہ پر فوج کشی کی اور اجین جو اس زمانے کا دار الحکومت تھا فتح کر لیا۔[1] اس حملے کا ظاہرا کوئی دیرپا نتیجہ نہ نکلا کیونکہ ۷۰۵ھ (۱۳۰۵ء) میں "مالوے کے رائے مہالک دیو اور اس کے پردھان کوکا نے اطاعت سے انحراف کیا" اور یوں سلطان علاء الدین خلجی کو ناراض کر دیا۔ شاہی فوج کا ایک منتخب دستہ مقرر کیا گیا اور بادشاہ نے اپنے رازداں میر حاجب "عین الملک کو حکم دیا کہ وہ مہالک دیو کو مالوے سے نکال باہر کرے اور اس قدیمی کفرستان کو عفونتِ کفر سے پاک کر دے"۔ ایک جاسوس نے قلعے (مانڈو) کا ایک خفیہ راستہ عین الملک کو دکھلا دیا اور اس سے پیشتر کہ راجا کے بتوں کو بھی خبر ہوتی اس نے مہالک دیو پر حملہ کر دیا، رائے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا کہ قتل ہو گیا اور مانڈو عین الملک کی حکومت میں شامل ہو گیا۔[2]

برخلاف اس کے فرشتہ کہتا ہے کہ مسلمانوں نے مالوہ پہلے پہل دہلی کے سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں (۱۳۸۹ء تا ۱۳۹۴ء) فتح کیا اور یہ رائے ظاہر کرتی ہے کہ اس زمانے سے یہ صوبہ سلاطینِ دہلی کی اطاعت کا دم

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶) بارھویں صدی تک کے زمانے کے شمار ہو سکتے ہیں۔ [1] برگس جلد ۱۔ ص ۱۹۳۔

[2] تاریخِ علائی ترجمہ الیٹ۔ جلد ۳۔ ص ۷۶ اور ۵۵۰

بھرتا رہا ہی آخر محمد شاہ کے عہد میں (۱۳۸۹ء تا ۱۳۹۴ء) صوبہ دار دلاور خاں غوری نے اقتدار کلی حاصل کر لیا۔[۱]

مانڈو کی تاریخ صحیح معنی میں دلاور خاں کے عہدِ حکومت سے شروع ہوتی ہی۔ اسی نے حکومتِ دہلی کی تباہی کے بعد جو تیمور کے حملے کا لازمی نتیجہ تھی، شاہی چھتر اور سرخ سراپردہ ۸۰۴ھ (۱۴۰۱ء)[۲] سے استعمال کیا۔ دلاور خاں کا اصلی نام حسین تھا۔ اس کے آبا و اجداد غور سے آئے اور سلاطینِ دہلی کے دربار میں نوکر ہوئے۔ حسین کی شہرت فیروز تغلق کے عہد میں ہوئی اور اس نے دلاور خاں کا خطاب حاصل کیا جو اتنا مقبول ہوا کہ گو اس نے "عمید شاہ داؤد"[۳] کا شاہی خطاب خود مختاریٔ مالوہ کے اعلان کے بعد اختیار کیا لیکن جب بھی وہ دلاور خاں ہی مشہور رہا۔ اس صوبے کی حکومت اس کو سلطان محمد ابنِ فیروز تغلق نے اُن خدمات کے صلے میں عطا کی تھی جو دلاور خاں نے اس کی شہزادگی کے زمانے میں انجام دی تھیں۔[۴]

دلاور خاں نے دھار کو دارالحکومت قرار دیا تھا لیکن اکثر مانڈو آتا رہتا تھا اور بعض اوقات ہینوس[۵] قیام کرتا۔ اس کا ایک نہایت بلند حوصلہ لڑکا

---

[۱] برگس۔ جلد۔ ۴۔ ص ۱۶۸ اور تزکِ جہانگیری (روگرس اور بیورج) جلد۔ ۲۔ ص ۴۰۷
[۲] برگس۔ جلد ۴۔ ص ۱۷۰ [۳] واقعاتِ مشتاقی میں (الیٹ، چہارم) ص ۵۵۲) دلاور خاں کا لقب" امین شاہ" ہی۔ یہ ظاہراً غلط ہی کیونکہ عمید شاہ ہی وہ لقب ہی جس کا ذکر جہانگیر نے کیا ہی (تزک ترجمۂ روگرس اور بیورج، جلد ۲۔ ص ۴۰۷) اور اس بادشاہ کے اُن کتبات میں بھی موجود ہی جو دھار کی لاٹ مسجد پر کندہ ہیں۔ (ہندستانی اسلامی کتبات ۱۰-۱۹۰۹، ص ۱۱-۱۲) [۴] فرشتہ (فارسی- جلد ۲، ص ۲۴۲) [۵] برگس جلد ۴۔ ص ۱۶۸۔

الپ خاں تھا جس نے تخت نشینی کے بعد ہوشنگ کا لقب اختیار کیا۔ فرشتہ لکھتا ہی کہ "دلاور خاں کا سلطان محمود تغلق بادشاہ دہلی کو خراج دینا الپ خاں کو ناپسند تھا کیونکہ امیر تیمور نے اس کو دارالسلطنت سے نکال باہر کیا تھا[1]۔ پھر جب سلطان محمود تغلق مالوے میں آکے رہا تو الپ خاں مانڈو چلا گیا اور اس مشہور قلعے کی بنیاد ڈالی جو بعد میں اس کے عہد حکومت میں مکمل ہوا[2]۔ مانڈو میں شہر پناہ اور دوسری ترقیوں کی ابتدا دلاور خاں کے عہد ہی میں کافی ہو چکی تھی کیونکہ تارا پور[3] دروازے پر جو کتبہ کندہ ہی اس سے معلوم ہوتا ہی کہ اس کو دلاور خاں نے ۸۰۹ھ (۱۴۰۶ء تا ۱۴۰۷ء) میں تعمیر کیا تھا یہ وہ زمانہ ہی جب شہر کا دوسرا نام غالباً اس کے دل فریب ماحول کی وجہ سے شادی آباد رکھا گیا۔ اس کا دوسرا ثبوت کہ یہ نیا شہر دلاور خاں کی مقبول تفریح گاہ بن گیا تھا اس کتبے سے ملتا ہی جو لاٹ مسجد دھار پر کندہ ہی سن کے ساتھ اس پر مقام "مانڈوگڑھ" درج ہی جس سے ظاہر ہوتا ہی کہ بادشاہ ان دنوں مانڈو

---

[1] فرشتہ لکھتا ہی کہ دلاور خاں نے شاہی خطابات اپنے لڑکے کے کہنے سے اختیار کیے۔ برگس۔ ص ۱۶۹ [2] ایضاً [3] تارا پور دروازے کے علاوہ دوسری عمارت جو دلاور خاں سے یقینی طور پر منسوب کی جاسکتی ہی وہ مسجد ہی جو جہاز محل کی پشت پر شاہی احاطے کے سرے کے نزدیک بنی ہی اس عمارت میں ایک کتبہ ہی اور یہ دلاور خاں کے نام سے اب بھی منسوب کی جاتی ہی ؎ ہندستانی اسلامی کتبات ۱۰ — ۱۹۰۹ ص ۲۰۔ [4] فرشتہ لکھتا ہی کہ یہ سلطان محمد غوری، مالوے کا تیسرا بادشاہ تھا جس نے مانڈو کو شادی آباد کا نیا لقب دیا لیکن اس کے والد ہوشنگ شاہ کے سکوں پر ٹکسالی نام شادی آباد درج ہی۔ تارا پور دروازے کے کتبے سے کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ شہر کا یہ نام دلاور خاں کے عہد میں رکھا گیا۔ برگس جلد ۴ ص ۱۹۱ ہندستانی عجائب خانہ کلکتے کی فہرست سکہ جات مرتبہ رایٹ جلد ۲ ص ۲، ۔۔ ۲۴۴

میں مقیم تھا جہاں کتبے کا نمونہ منظور ہوا[1]۔

۱۴۰۵ء میں دلاور خاں کا انتقال ہو گیا اور الپ خاں باپ کے تخت پر ان القاب کے ساتھ متمکن ہوا:-

السلطان الاعظم حسام الدنیا والدین ابوالمجاہد ہوشنگ شاہ سلطان[2]

اس نے مالوے پر تقریباً ستائیس برس حکومت کی اور اپنی سلطنت شمال میں کالپی تک اور جنوب میں کھیرلا تک بڑھائی۔ مغرب میں سلاطین گجرات سے مسلسل جنگ کرتا رہا۔ اس کی اس بلند حوصلگی و جنگ جوئی کی وجہ سے سید مبارک شاہ، بادشاہِ دہلی (۳۳-۱۴۲۱) جونپور کے ابراہیم شاہ شرقی (۴۰-۱۴۰۰) اور گلبرگے کے احمد شاہ بہمنی (۳۵-۱۴۲۲)[3] سے چشمک رہی ہوشنگ شاہ کے عہد میں مانڈو کا کئی مرتبہ محاصرہ ہوا اور ایک مرتبہ تو مظفر شاہ گجرات اس کو قید کر کے لے گیا اور نصرت خاں مالوے کا حاکم مقرر ہوا لیکن تقدیر نے ہوشنگ کا ساتھ دیا وہ رہا کر دیا گیا اور پھر مالوے کا مالک بن گیا[4]۔

اس کی شجاعت کا بہترین کارنامہ وہ لشکر کشی تھی جو اس نے ہاتھیوں کے حاصل کرنے کے لیے راجا جاجنگر (اڑیسہ) پر کی فرشتے نے اس کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور میں اس کا اقتباس یہاں دیتا ہوں "۸۲۵ھ (۱۴۲۱ء) میں ہوشنگ مانڈو سے سوداگروں کے لباس میں ایک ہزار منتخب سواروں کے ساتھ نکلا اور جاج نگر کی طرف جو مالوے سے ایک مہینے کے راستے پر ہے روانہ ہوا

---

[1] ہندستانی اسلامی کتبات ۱۰-۱۹۰۹، ص ۱۲۔ [2] رایٹ، جلد ۲- ص ۷ - ۲۴۶

[3] برگس جلد ۴- ص ۸۵-۱۷۲۔ [4] برگس جلد ۴- ص ۵ - ۱۸۳ اور آئینِ اکبری (ترجمہ جیرٹ جلد ۲ ص ۲۰ - ۲۱۹)

اس نے اپنے اصل مقصد کو پوشیدہ رکھنے کے لیے مختلف رنگوں کے گھوڑے لیے مثلاً نقرہ، سبزہ، ہمرنگ، کبود، جو مشہور تھا کہ جاج نگر کے راجا کو بہت پسند تھے اور بہت سی ایسی اشیا بھی ہمراہ لیں جو ملک جاج نگر میں نایاب تھیں اور جن کے عوض میں راجا ہاتھی دینا پسند کرتا تھا۔ یہ بنے ہوئے سوداگر وہاں پہنچے۔ راجا نے اپنے دستور کے مطابق پہلے اپنا ارادہ کتان کے کپڑے دیکھنے کا ظاہر کیا اور کہلا بھیجا کہ یا تو وہ ان کو روپیہ دے کر خریدے گا اور یا ہاتھی معاوضے میں دے گا۔ مقررہ دن آ پہنچا اور سامان زمین پر چن دیا گیا لیکن چونکہ برسات کا موسم تھا سلطان ہوشنگ نے لوگوں سے کہا اگر بارش آ گئی تو سامان برباد و ضائع ہو جائے گا۔ راجا کے نوکر اس پر مُصر ہوئے کہ جب تک راجا نہ آ جائے تمام اشیا اسی طرح کھلی رکھی رہیں اس وقت تمام گھوڑوں پر معائنے کے لیے کاٹھیاں کس دی گئی تھیں۔ آخر کار راجا آیا اور اس کے آتے ہی بڑی زور کی آندھی آئی اس کے جنگی ہاتھیوں نے تمام اشیا کچل ڈالیں اور بہت نقصان کیا۔ سلطان ہوشنگ کو اس نقصان پر بہت طیش آیا اور اس نے اپنے ہمراہیوں کو گھوڑوں پر سوار ہونے کا حکم دیا اور بغیر کسی پس و پیش کے راجا کے ساتھیوں پر حملہ آور ہوئے جن میں بہت سے قتل ہوئے خود راجا قید ہوا۔ اس کے بعد ہوشنگ نے اس کو اپنے اصلی مرتبے سے مطلع کیا۔ ایسی حالت میں راجا جاج نگر نے اپنی آزادی ۷۵ ہاتھی کو دے کر خریدی لیکن سلطان ہوشنگ نے احتیاط کے طور پر اس کو اپنے ساتھ جاج نگر کی سرحد تک چلنے پر مجبور کیا اور چند بہترین ہاتھی لے کر اس کو رخصت کیا۔[۵۱]

ہوشنگ باوجود اپنی جنگ جو فطرت کے ایک دردمند دل رکھتا تھا جس کی وجہ سے

---

[۵۱] برگس جلد ۴۔ ص ۹-۱۷۸ اور آئین (مترجمہ جیرٹ) جلد ۲۔ ص ۲۱۹۔

رعایا اس کی پرستش کرتی تھی[1] اس کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد اس کے مقبرے کو مقدس خیال کیا جانے لگا اور ابھی کچھ عرصے پہلے تک ہر سال اس کے مزار پر بہت بڑا عرس ہوتا تھا کیونکہ "بمبئی سب الٹرن" نے اس کا حوالہ اپنے مضمون میں دیا ہے جو ۱۸۴۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ابوالفضل نے اپنے ارتیابی طرز میں اس معجزے کو جو شاہ ہوشنگ کے مزار سے منسوب کیا جاتا تھا کہ پتھر بادشاہ کی موت پر آنسو بہاتے ہیں باطل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ "ایک عجیب بات یہ ہے کہ گرمیوں میں سلطان ہوشنگ کے مقبرے میں گنبد کی چھت سے پانی ٹپکتا ہے اور سادہ لوح اس کو کرامت قرار دیتے ہیں[2]" لیکن عقل مند اس کا مناسب سبب بتا سکتے ہیں۔ اس بداعتقادی کے زمانے میں یہ معجزہ ظہور پذیر نہیں ہوتا جس سے خوش عقیدہ معتقد بے حد حیران ہیں۔ شاید یہ سلسلہ اس سبب سے منقطع ہوگیا کہ چونا عمارت کے جوڑوں میں جم گیا جو پیشتر بادلوں سے رطوبت حاصل کر کے بادشاہ کی موت پر رحم کے اشک بہاتے تھے۔

ہوشنگ کے نام کو آیندہ نسلوں تک پہنچانے کا سب سے بڑا سبب اس کا عمدہ مذاقِ تعمیر ہے جس نے مانڈو کو ہندستان کے ناقابلِ تسخیر

---

[1] وہ بہت بے تعصب حکمراں بھی تھا۔ صوبۂ متحدہ میں للت پور کے پاس دیوگڑھ میں ایک کتبہ ۱۰۸۰ سمت (۱۴۲۴ء) کا ہے جس میں تحریر ہے کہ دو جینی مورتوں کا تہدیہ مندا پار پورا کے شاہ عالم بھا کا یعنی شاہ الپ خاں (ہوشنگ شاہ) والی مانڈو کے عہد میں ہوا۔ ملاحظہ ہو مانڈو از کیمبل (جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ ۲۹ - ۱۶۳

[2] آئین (جیرٹ) جلد ۲ ص ۱۹۷۔ فرشتہ بھی ہوشنگ شاہ کی تاریخ کی بنا پر اس واقعہ کو تحریر کرتا ہے۔ "پانی اس کے قوسی چھت کے پہلوؤں میں پتھر کی درازوں کی مورچہ بندی سے مسلسل رستا ہے"۔ برگس ص ۱۹۰

قلعوں[1] ہی میں نہیں بلکہ ایک شاندار شہر بھی بنا دیا۔ اس نے بہت سی رفیع الشان عمارتیں تعمیر کیں جن میں مسجد، دہلی دروازہ اور خود اس کا مقبرہ شان و شکوہ اور تکمیل کی نفاست کے باعث مشرق کی بہترین عمارتوں میں شمار ہوتے ہیں[2]
سلطان ہوشنگ شروع ہی سے ملک محمود کی جانب جو اس کے بھتیجے ملک مغیث[3] وزیرِ اعظم کا لڑکا تھا زیادہ ملتفت تھا۔ آگے چل کر اسے خاں کے خطاب سے سرفراز اور اس کے باپ کا نائب مقرر کیا اس نے یہ بھی حکم دیا کہ ہر جنگ میں

[1] فرشتہ اور شہنشاہ جہانگیر دونوں نے قلعے کی مورچہ بندی کا ذکر مدحیہ الفاظ میں کیا ہے اور قبل الذکر کی تحریر سے ایک اقتباس غالباً ناظرین کی دل چسپی کا سبب ہوگا۔ وہ لکھتا ہے "یہ قلعہ چونکہ تمام دنیا میں عجیب و غریب ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ذکر یہاں مناسب ہوگا۔ یہ قلعہ الگ ایک پہاڑ کی چوٹی پر تعمیر ہوا ہے کہتے ہیں کہ انیس کوس (۲۸ میل) کے گرد میں ہے۔ باقاعدہ خندق کی بجائے اس کے گرد ایک گہرا نالہ ہے جس کو قدرت نے قلعے کے چاروں طرف بنا رکھا ہے اور جو اتنا عمیق ہے کہ کسی کا قلعے تک آسانی سے پہنچنا ممکن نہیں۔ قلعے میں پانی اور چارا بہ افراط ہے گو کاشتکاری کے لیے جگہ کافی نہیں ہے ایک فوج جو مانڈو کا محاصرہ کر رہی ہو اس کو اپنی کوششیں محض سڑک کے ناکے بندی تک محدود رکھنی پڑتی ہیں کیونکہ اتنی لمبی چوڑی جگہ کا محاصرہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ قلعے کی بہت سی سڑکیں ڈھالو اور ناقابلِ رسائی ہیں۔ وہ سڑک جو دکھن کی جانب یعنی تارا پور دروازے کو جاتی ہے اتنی ڈھالو اور خراب ہے کہ سواروں کا رسالہ مشکل سے اوپر جانے کا راستہ پا سکتا ہے اور جس طرف سے بھی جاؤ ایک درہ حائل ہوتا ہے اسی وجہ سے دشمن کی فوج گو بعض قابل گزار سڑکوں پر قابض کیوں نہ ہو لامحالہ منقسم ہو جاتی ہے اور ایک جماعت دوسری سے اس طرح جدا ہوتی ہے کہ وہ اس کی امداد نہیں کر سکتی۔ وہ سڑک جس سے رسائی نہایت آسان ہے شمال میں دہلی دروازے کو جاتی ہے۔ برگس۔ ۴ ص ۱-۱۸۰ [2] ان عمارات کا بیان آگے آئے گا [3] ملک مغیث نے (بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴ پر)

بادشاہ کے ہمراہ رہے اور ملک مغیث دارالسلطنت میں رہے۔ اس طرح محمود خاں کا اقتدار رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ جب بادشاہ سخت بیمار ہوا اور زندگی کی کوئی امید نہ رہی تو اس نے اپنے سب سے بڑے لڑکے غزنین خاں کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اس کا ہاتھ محمود خاں کے ہاتھ میں دیا۔ محمود خاں نے شہزادے کے تخت نشینی کے حق کو آخری دم تک قائم رکھنے کا وعدہ کیا۔[۱] ۹ ذولحجہ ۸۳۵ھ (۷ اگست ۱۴۳۲ء) کو سلطان ہوشنگ کا انتقال ہوا[۲] اور اس کے دو دن بعد غزنین خاں تخت نشین ہوا۔ اس نے یہ لقب اختیار کیے "سلطان الاعظم، تاج الدنیا والدین، ابوالمجاہد محمد شاہ سلطان"[۳] شروع میں محمود خاں بادشاہ کی اطاعت کا دم بھرتا رہا لیکن بعد میں جب سازش و بغض سے خود اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تو پھر اس نے بادشاہ کے قتل کی تدبیریں میں پس و پیش نہ کیا

(بقیہ صفحہ ۱۳) موسیٰ خاں کے مقابلے میں سلطان ہوشنگ کا ساتھ دیا۔ مظفر شاہ والئ گجرات ہوشنگ کو جب قید کر کے لے گیا تو اس زمانے میں موسیٰ خاں مالوے کا حکمراں ہوا۔ ہوشنگ نے دوبارہ بادشاہت حاصل کرنے پر ملک مغیث کو اپنا وزیر بنایا اور اپنے عہدِ حکومت میں اس پر پورا اعتماد کیا۔ برگس جلد ۴۔ ص ۱۷۴۔

[۱] برگس۔ ص ۱۷۷، ۱۷۸ اور ۱۸۸

[۲] ہوشنگ کی لاش کچھ عرصے کے لیے ہوشنگ آباد میں دفن کی گئی۔ برگس جس نے اکتوبر ۱۸۱۶ء کو یہ مقام دیکھا لکھتا ہے "دفنانے کا مقام مجھ کو بعض مسلمان حضرات نے جو وہاں آباد ہیں دکھلایا۔ تاریخ وفات اب بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

شہہ والا قدر سلطان ہوشنگ سوئے دارالبقا چوں کرد آہنگ
بہ پرسیدم زہاتف سالِ تاریخ ندا آمد نماندہ شاہ ہوشنگ

[۳] فہرست مرتبہ رائٹ۔ ص ۲۴۷

اس نے ساقی کو رشوت دے کر شراب[۱] میں زہر دلوا دیا۔ یہ واقعہ ۸۴۰ھ (۱۴۳۶ء) میں ہوا پھر محمود خاں نے پہلے اپنے والد کو مدعو کیا کہ وہ آ کر زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ "حکومت کے معاملات کے لیے خود وہی نہایت موزوں ہے"[۲]۔

محمد غوری کے عہد کی کوئی یادگار عمارت سوائے ملک مغیث کی مسجد[۳] کے موجود نہیں۔ یہ مسجد ساگر جھیل کے مشرق میں ہے اور اس پر کتبہ مورخہ ۴ رجب ۸۳۵ھ (۱۰ مارچ ۱۴۳۲ء)[۴] کندہ ہے اس کتبے سے یہ اختلاف پیدا ہوتا ہے کہ متذکرہ بالا تاریخ جو اس میں درج ہے وہ ہوشنگ شاہ کی وفات (۱۷ اگست ۱۴۳۲ء) سے چند سال قبل کی ہے۔ عبارت میں محمود خلجی کا نام بحیثیت بادشاہِ وقت کے آیا ہے حالانکہ اس نے شاہی لقب ۱۴۳۶ء تک اختیار نہیں کیا[۵] تھا۔ اس کی قرینِ قیاس توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ مسجد کی تعمیر ہوشنگ کے آخری سالِ حکومت

۱؎ عہدِ محمد غوری (۱۴۳۲ء تا ۱۴۳۶ء) کی سازشوں اور دغا بازیوں کے لیے ناظرین کو واقعاتِ مشتاقی (رالیٹ ۴-۵۵۲) برگس ۴۴۰-۱۹۲ اور آئینِ اکبری (ترجمۂ جیرٹ) جلد ۲-ص ۲۲۔ ملاحظہ کرنا چاہیے۔

۲؎ ملک مغیث نے اپنے مربی سلطان ہوشنگ کی اولاد کے ساتھ ہمیشہ ادب کا سلوک کیا اور جب اس کے لڑکے محمود کے عہد میں فساد برپا ہوا جس میں مرحوم بادشاہ کے لڑکے بھی شامل تھے تو ملک مغیث نے ان کی طرف داری کی اور ان کو معاف کرایا۔ برگس۔ ص ۱۹۴ اور ۸-۱۹۷

۳؎ عمارت کا بیان ملاحظہ ہو آیندہ اوراق میں۔

۴؎ ہندستانی اسلامی کتبات ۱۰-۱۹۰۹، ص ۲۱ -

۵؎ فہرست مرتبۂ رابیٹ۔ جلد ۲-ص ۲۴۲، ۲۴۷

(۸۳۵ھ ۱۴۳۲ء) میں شروع ہوئی لیکن اُس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچی جب محمود خلجی نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا۔ اس طرح محرر کتبہ نے عمارت کے آغازِ تعمیر کی صحیح تاریخ دی ہی لیکن کتبے کا مسودہ چونکہ بادشاہِ وقت کے روبرو تیار ہوا لہذا اس کی خوشنودی کے لیے کاتب کو محمود خلجی کا نام درج کرنا پڑا۔[۱]

محمود خلجی نے سلطان ہوشنگ کا شاہی تاج ۸۴۰ھ (۱۴۳۶ء) میں زیبِ سر کیا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور سکّہ چلایا[۲] اسی موقع پر اس نے سلطنت کے امرا کو خلعت عطا کیا اور اپنے والد کو جسے ملک اشرف، خاں جہاں کا معزز لقب حاصل تھا اس سے بھی زیادہ بلند خطابات امیر الامرا و اعظمِ ہمایوں سے سرفراز کیا۔[۳] سفید چتر اور چاندی کے ترکش کے استعمال کی اجازت عطا کی جو خاص شاہی نشانات تھے اس کے علاوہ یہ حق بھی اس کو حاصل تھا کہ نقیب و چوب دار اس کے ساتھ سونے اور چاندی کے عصالے کر آگے آگے چلیں اور جب وہ عوام میں گزرے تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے ہوئے اس کے خطابوں کو بآواز بلند ادا کریں[۴] محمود خلجی کو اپنے والد سے بے حد محبت تھی اور جب اس کے والد کا انتقال مندسور

---

[۱] محمد غوری کے سکّے جن میں شاہی لقب اور تاریخ ۸۴۰ھ (۱۴۳۶ء) درج ہی۔ مختلف عجائب خانوں میں ملتے ہیں اس لیے یہ ممکن نہیں کہ محمود خلجی نے رجب ۸۴۰ھ (۱۴ مارچ ۱۴۳۶ء) میں شاہی لقب اختیار کیا ہو جیسا کہ اس کتبے میں درج ہی۔ محمد غوری کے سکّوں کے لیے رایٹ کی فہرست ملاحظہ ہو جلد ۲۔ ص ۲۴۷۔

[۲] برگس جلد ۴ ص ۱۹۶ اور ایٹ ۲ ص ۲۴۲۔ بادشاہ کے القاب جو اس کے سکّوں پر درج ہیں یہ ہیں: "سلطان الاعظم، الدنیا والدین، ابوالمظفر محمود شاہ خلجی سلطان" جن میں اس نے زیادہ معزز القاب کا اضافہ کیا: "سکندر الثانی و یمین الخلافت ناصر و امیر المومنین"۔

[۳] فرشتہ (فارسی) جلد ۲ ص ۲۷۹، [۴] برگس جلد ۴۔ ص ۱۹۶

کے محاصرے میں ہوا تو اس پر غم کا پہاڑ پھٹ پڑا۔ اس نے "سر کے بال نوچے اور ہذیان اس طرح بکنا شروع کیا جیسے کسی کے حواس جاتے رہے ہوں"۔[51]

محمود خلجی کے عہد کا پہلا اور دوسرا سال تاج و تخت کے دوسرے حق داروں کو شکست دینے اور گجرات کے حملے کا مقابلہ کرنے میں گزر گیا۔ اس نے استقامت حاصل کرنے کے بعد اپنے تینتیس ۳۳ سال کے عہدِ درازکا زیادہ حصہ توسیعِ سلطنت میں صرف کیا اور سلطنتِ مالوہ کی حدود کہیں سے کہیں پھیل گئیں میواڑ کے سرحدی صوبے کے خلاف اکثر مہمیں بھیجی گئیں جو یکے بعد دیگرے کام یاب و ناکام یاب ہوتی رہیں۔ رانا کمبھ کو ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں مجبوراً مالوے کا حاکمانہ اقتدار تسلیم کرنا پڑا۔[52] رانا میواڑ کے خلاف محمود خلجی نے مختلف فتوحات حاصل کیں جن میں سے ایک فتح کی یادگار ایک مینار جو سات منزل بلند تھا مانڈو میں تعمیر کیا اس کا ایک حصہ اب بھی قائم ہے۔[53]

محمود خلجی نے اپنی سلطنت کے شمال میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں بوندی، کوٹاہ، بیانہ، رنتھمبور اور قرولی کو مطیع کر لیا اور ۸۵۹ھ (۱۴۵۷ء) میں منڈسور کی قلم رو اور اجمیر کو بھی فتح کر لیا۔[54] والیانِ گجرات، جونپور اور دکن کے خلاف جنگ شروع کی گئی اور یہاں تک کہ سلطان کو بھی بے لڑے نہ چھوڑا۔[55]

---

[51] برگس۔ ۴۔ ص ۲۰۹۔ [52] برگس ص ۲۲۲ [53] اس کا بیان آگے آتا ہے [54] برگس ص ۲۳۲۔

[55] فرشتہ دہلی کی مہم کا سبب یوں بیان کرتا ہے "۸۴۴ھ میں سلطان محمود کو میوات اور دہلی کے سرداروں کی درخواستیں ملیں جن میں تحریر تھا کہ سید محمد، شہنشاہ دہلی، سید مبارک کا بھتیجا اور جانشین، وسیع سلطنت کے امورِ خطیر کا انتظام جیسا کہ چاہیے نہیں کر سکتا مصیبت زدہ ہر طرف سے فریاد کر رہے ہیں اور قوم کو اس کا سخت انتظار ہے کہ سلطان محمود دہلی پر لشکر کشی کرے اور تخت پر جلوہ افروز ہو۔ لہذا سلطان محمود (بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۸ پر)

وہ علم و ادب کا بڑا مربی تھا اور اپنی سلطنت کے مختلف حصّوں میں اشاعتِ ادب کی غرض سے مدرسۃ العلوم قائم کیے جس کا یہ اثر ہوا کہ مالوے کے حکما و علما شیراز و سمرقند کے علما و فضلا کے ہم پایہ ہوگئے[۱]۔

فرشتہ نے اس بادشاہ کی سیرت کی تعریف دل کھول کر کی ہے۔ وہ لکھتا ہے "سلطان محمود خلیق، شجاع، عادل اور سخی تھا۔ اس کے عہد میں اس کی رعایا ہندو مسلمان دونوں خوش تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے۔ مشکل سے کوئی سال ایسا گزرتا کہ وہ لڑائی پر نہ جاتا ہو۔ اسی سبب سے خیمہ اس کا گھر بن گیا تھا اور میدانِ جنگ اس کی آرامگاہ۔ فرصت کے وقت وہ دنیا کے مختلف بادشاہوں کے درباری حالات اور تاریخیں پڑھوا کر سنا کرتا۔ اس کو بہت ناز تھا اور کچھ بیجا بھی نہ تھا کہ وہ انسانی فطرت کا صحیح علم رکھتا ہے۔ اس کو اس موضوع سے خاص دلچسپی تھی[۲]"۔

اس کی فوجی طاقت اور ذاتی خوبیوں کی شہرت اسلامی دنیا میں پھیل گئی تھی کیونکہ اس کے دربار میں نبیرۂ تیمور سلطان ابو سعید جو ماوراء النہر میں حکمراں تھا اور امیر المومنین مستعد باللہ یوسف، ابن محمد عباسی، خلیفۂ مصر نے اپنے سفیر بھیجے ان اعزاز سے مسرور ہو کر اس نے بھی اپنے سفیروں کو نایاب تحائف کے ساتھ روانہ کیا۔ مثلاً مختلف قسموں کی ململیں، عربی گھوڑے، رقاصہ و مغنّی جو سجے ہوئے شاندار ہاتھیوں پر بٹھا کر بھیجے گئے۔ مختلف ہندستانی و حبشی غلام حرم سرا کے لیے اور چند مینائیں اور طوطے جن کو فارسی زبان سکھائی

(بقیہ صفحہ ۱۷) نے آخر سنہ مذکور میں اپنی فوج اس مقصد کے لیے روانہ کی۔" برگس ص ۶-۲۰۵ اور ایلیٹ، ۴، ص ۸۵۔

[۱] برگس، ۴، ۱۹۷ [۲] برگس ۲۳۴

گئی تھی روانہ کیے۔[۵۱]

محمود خلجی کو بھی تعمیر کا بیحد شوق تھا۔ جامع مسجد، مقبرۂ ہوشنگ شاہ کی تعمیر اور ہوشنگ کے محل کی مرمت کے علاوہ اس نے مانڈو اور چند دوسرے[۵۲] مقامات میں بلند و بالا عمارتیں تعمیر کرائیں۔ ان سب میں بیحد شاندار خود اس کا مقبرہ ہے جو سرتاسر سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور اس کی کرسی بہ نسبت دوسرے مقبروں اور ہوشنگ کی جامع مسجد کے زیادہ بلند ہے۔ یہ رفیع الشان عمارت اکبر کے عہد ہی میں مخدوش حالت میں تھی اکبری معماروں نے اس کی مرمت بھونڈے پن سے کی اور سنگِ مرمر کی خوب صورت سلوں میں سرخ پتھر کے پیوند لگا دیے۔[۵۳]

محمود کے دوسرے کاموں میں اس مدرسۃ العلوم کا ذکر (مدرسہ اسی عمارت میں تھا جس کو اب اشرفی محل کہتے ہیں) ضروری ہے جو اس نے سلطان ہوشنگ کی مسجد کے مقابل بنایا تھا جس کے ایک سرے پر (شمال مغرب) وہ خوب صورت ستونِ فتح ہے[۵۴] جو اس نے میواڑ کے رانا کمبھ کی یادگارِ شکست کے طور پر قائم کیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی عمارت خود اس کی زندگی ہی

---

۵۱ برگس جلد ۴۔ ص ۲۲۹ اور ۲۳۲۔ ابوالفضل (ترجمہ جیرٹ۔ جلد ۲۔ ص ۲۲۰) سلطان ابوسعید کے سفیر کے متعلق لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ اس سے محمود خلجی کی عظمت میں اضافہ ہوا۔

۵۲ بادشاہ نے کچھ خوب صورت محل اور مسجدیں نلچھا میں تعمیر کیں جو دھارا اور مانڈو کے راستے میں ایک قصبہ ہے ۱۸۱۰ء میں سر جان مالکم (وسطِ ہند، جلد ۱۔ ص ۳۲) نے محمود کے ایک محل کو گرمیوں میں قیام کے لیے درست کرایا محمود نے فتح آباد میں بھی ایک سات منزلہ محل بنوایا۔ برگس ۴ ص ۲۳۱۔

۵۳ آگے آتا ہے ۵۴ ص ۴۷

میں کچھ تبدیل کی گئی کیونکہ ہم کو پتا چلتا ہی کہ اس کی قبر کا تہ خانہ اس صحن کو بھر کر بنایا گیا جو مدرسے[۵۱] کا داخلی چوک تھا۔ محمود کی عمارتوں کا طرز نہایت شاندار تھا لیکن چونکہ وہ جلدی میں تعمیر ہوئیں یا نااہل میرِ عمارت کی نگرانی میں بنیں اس لیے اس کے عہد کے بعد ہی منہدم ہوگئیں اور اب کھنڈر پڑی ہیں۔

فرشتہ لکھتا ہی کہ ۸۴۹ھ (۱۴۴۵ء) میں سلطان نے ایک بہت بڑا شفاخانہ مانڈو میں قائم کیا اور اس کی امداد کے لیے زمین معافی میں دے کر خود اپنے حکیم فضل اللہ کو اس ادارے کا نگراں مقرر کیا۔ اس شفاخانے کا انتظام اس قدر عمدہ تھا کہ اس میں سب طرح کے مریضوں کے لیے کمرے اور نوکر تھے اور پاگلوں کے لیے سب سے الگ ایک حصّہ[۵۲] تھا۔

۸۷۳ھ (۱۴۶۹ء) میں محمود خلجی کھواڑ پر فوج کشی کرکے واپس آرہا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ یہ اس کے عہد کا تینتیسواں سال تھا۔ اس کا سب سے بڑا لڑکا غیاث الدین جانشین ہوا[۵۳]۔

یہ بادشاہ نہایت منصف و رحمدل تھا اور جیسے ہی وہ تخت نشین ہوا اس نے خود اپنے چھوٹے بھائی فدوی خاں کو رنتھمبور کی حکومت ہمیشہ کے لیے بخش دی اور خود اپنے لڑکے عبدالقادر کو وزیرِ اعظم مقرر کیا اور اپنا ولی عہد بنایا۔ سلطان ناصر الدین لقب دیا اور پالکی اور چھتر کے استعمال کا اعزاز بخشا۔[۵۴] غیاث الدین نے

---

[۵۱] ص ۲، [۵۲] برگس۔ ۴۔ ۲۳۳ [۵۳] فرشتہ نے اس بادشاہ کی تاریخِ وفات لکھی ہی (۱۹ ذی قعدہ ۸۷۳ھ)

شہِ والاقدر سلطان محمود چو شد از امرِ حق رحلت گزینے

بہ پرسیدم ز ہاتف سالِ تاریخ ندا آمد کہ شد جنت نشینے

[۵۴] برگس۔ ۴۔ ۲۳۶۔ اس کے سکوں کے سمجھنے سے پتا چلتا ہی کہ غیاث الدین کے حسب ذیل خطابات ہیں۔ الواثق بالملک المتجی ابوالفیض غیاث شاہ الخلجی۔ فہرست رایٹ۔ ۲۔ ۲۵۰۔

اُن مختلف مہموں میں جو سلطان مرحوم کی سرکردگی میں روانہ ہوئیں نمایاں خدمات بحیثیت سالارِ فوج کے انجام دی تھیں مگر زمامِ حکومت سنبھالنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ وہ تلوار اپنے لڑکے کو سونپ دے گا اور خود آرام وسکون کی زندگی بسر کرے گا۔[۵] مورخوں نے اس کی سیرت کے متعلق مختلف رنگ آمیزیاں کی ہیں اور اس کی رحمدل طبیعت کے پہلوؤں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ اس کو عورتوں سے بھی عجیب انس تھا اور اپنی حرم سرا میں دربار کے مختلف عملے قائم کیے تھے۔ ایک زمانے میں پندرہ ہزار عورتیں اس کی خدمت میں رہتی تھیں۔ فرشتہ لکھتا ہے" ان میں استانیاں، گانیں، ناچنے والیاں، کارچوب ڈالنے والیاں، حافظ، تاجر، اور مختلف پیشہ ور عورتیں تھیں۔ پانچ سو خوب صورت جوان ترکی عورتیں مردانہ لباس میں وردی پہنے ہوئے ترکش اور سماں سے مسلح اس کے داہنے ہاتھ پر کھڑی ہوتیں اور "سپاہ ترک" کہلاتی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر پانچ سو حبشی عورتیں وردی پہنے ہوئے آتشیں اسلحہ سے مسلح ایستادہ ہوتیں۔"[۶]

---

[۵] برگس ص ۱۸۔ ۲۱۷۔ [۶] برگس ۴۔ ص ۷۔ ۲۳۶۔ جہانگیر نے بھی ایسے ہی حالات لکھے ہیں جن میں کچھ واقعات کا اضافہ کیا ہے" کہتے ہیں کہ اس نے اپنے حرم میں پندرہ ہزار عورتیں جمع کی تھیں۔ اور پورا عورتوں کا ایک شہر بسا لیا تھا جس میں ہر ذات، قسم اور طرز کی عورتیں تھیں مثلاً اہلِ حرفہ، حاکم فوجداری، قاضی، کوتوال اور جو کچھ بھی انتظام شہر کے لیے ضروری تھا۔ جہاں کہیں وہ کسی حسین دوشیزہ کے متعلق کچھ سنتا اس وقت تک چین نہ لیتا جب تک اس کو حاصل نہ کرلیتا۔ اس نے لڑکیوں کو مختلف قسم کی صنعت وحرفت سکھلائی تھی۔ اس کو شکار کا بڑا شوق تھا اور ہرنوں کا ایک رمنہ بنایا تھا جس میں ہر قسم کے جانور جمع کیے تھے۔ اس میں اکثر عورتوں کے ساتھ شکار کھیلنے جاتا تھا" روجرس اور بیورج جلد ۲ ص ۵ — ۳۶۶۔

اس غیر معمولی شوق سے قطعِ نظر کریں تو غیاث الدین نہایت مذہبی آدمی تھا۔ اس نے اپنی پنج وقتہ نماز کبھی قضا نہیں کی اور نہ کبھی شراب پی نہ کبھی منشیات کا شوق کیا۔ "واقعاتِ مشتاقی" میں ایک دل چسپ قصہ اس کی منشیات کی نفرت کے متعلق درج ہے جو یہاں پیش کیا جاتا ہے[۱]۔ ایک دن اس کے لیے معجون بنائی گئی اور جب تیار ہو گئی تو اس کو مطلع کیا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ معجون لانے سے پہلے اس کے سب اجزا بتائے جائیں چنانچہ فہرست آئی اور پڑھ کر سنائی گئی۔ اس میں تین سو سے زیادہ دوائیں تھیں اور اس میں کچھ مقدار جائفل کی تھی۔ اس نے کہا کہ یہ دوا اس کے کام کی نہیں۔ ایک لاکھ ٹنکوں سے زیادہ اس کی تیاری میں صرف ہوا تھا۔ لیکن اس نے حکم دیا کہ دوا اس کے سامنے لا کر نالی میں پھینک دی جائے۔ ایک شخص نے التجا کی کہ وہ کسی کو دے دی جائے لیکن اس نے جواب دیا کہ جس شے کو وہ خود پسند نہیں کرتا وہ دوسروں کو کیوں دے گا[۲]۔"

غیاث الدین نے ان مختلف صلح ناموں[۳] سے فائدہ اٹھایا جو اس کے والد کے زمانے میں قرب و جوار کی سلطنتوں سے کیے گئے تھے۔ اس کے عہد میں سلطنتِ مالوہ پر کوئی حملہ نہیں ہوا سوائے اس حملے کے جو بہلول لودھی نے رنتھمبور پر کیا۔ اس کا مقابلہ نہایت کامیابی سے کیا گیا اور بہلول کو ایسی سزا ملی کہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ بطورِ تاوان کچھ رقم بھی ادا کرے[۴]۔

مصنف "مرآۃِ سکندری" نے غیاث الدین کے متعلق لکھا ہے کہ وہ مانڈو میں نہایت آزاد خیالی۔ و حسنِ انتظام[۵] کے ساتھ حکومت کرتا تھا۔ اس رائے کی تصدیق اس کے انصاف اور سخاوت کی داستانوں[۶] سے بھی ہوتی ہے

---

[۱] الیٹ۔ ۴۔ ۵۵۵۔ [۲] برگس۔ جلد ۴۔ ۲۲۲۔ ۲۳۰) [۳] الیٹ۔ ۴۔ ۲۳۷۔

[۵] گجرات مصنفہ بیلے۔ ص ۱۶۹۔

جو مختلف مورخوں نے جانوروں اور پرندوں کے متعلق بیان کی ہیں[1]
اس کے عہد حکومت کے آخر میں اس کے نوجوان لڑکے شجاعت خاں اور ناصر الدین ولیعہد کے درمیان دشمنی ہوگئی اور اس حد تک پہنچی کہ ناصر الدین نے یہ سوچ کر کہ کہیں وہ تاج و تخت سے محروم نہ کر دیا جائے ضعیف بادشاہ کو زہر دے دیا۔ جہانگیر نے اس واقعہ کو نہایت متاثر ہو کر لکھا ہے "یہ مشہور بات ہے کہ اس بدبخت (ناصر الدین) نے خود اپنے باپ غیاث الدین کو جس کی عمر اسی برس کی تھی قتل کر کے تخت حاصل کیا۔ دو مرتبہ اس نے زہر دیا اور دونوں مرتبہ زہر مہرے نے جو اس کے بازو پر بندھا ہوا تھا زہر کا اثر زائل کر دیا۔ تیسری مرتبہ اس نے شربت کے پیالے میں زہر ملایا اور اپنے ہاتھ سے یہ کہہ کر دیا کہ اس کو پینا پڑے گا۔ چونکہ اس کا باپ سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کوشش کر رہا ہے اس نے زہر مہرہ اپنے بازو سے کھول کر اس کے آگے ڈال دیا اور بڑے عجز و نیاز سے رُخ بارگاہِ خالقِ بے نیاز کی جانب کیا اور کہا "اے پروردگار! میری عمر اسی برس ہو لے آئی اور میں نے یہ زمانہ ایسے عیش و آرام میں بسر کیا ہے جو کسی بادشاہ کو نہیں نصیب ہوا۔ اب جب کہ میرا آخری وقت ہے مجھے امید ہے کہ تو ناصر کو میرے قتل کی پاداش میں نہ پکڑے گا اور یہ سمجھ کر کہ میری موت معین تھی تو درگزر کرے گا"۔ وہ یہ الفاظ کہہ کر اس شربت کے پیالے کو جس میں زہر ملا تھا ایک سانس میں پی گیا اور اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی[2]۔"

---

[1] فرشتہ لکھتا ہے "ایک دن شاہی محل میں اس نے چوہے کو دیکھ کر یہ حکم دیا کہ اس کو چاول اور روٹی روزانہ دیے جائیں اور یہی حماقت پالتو کبوتروں اور توتوں کے ساتھ کی گئی۔ برگس۔ ج۴۔ ۲۳۷۔ ناظرین کی توجہ واقعاتِ مشتاقی کی جانب مبذول کرائی جاتی ہے جس میں بادشاہ کی سخاوت و رحم کے اکثر دل چسپ واقعات درج ہیں۔ الیٹ۔ ج۴۔ ۵۵۵۔ [2] شہنشاہ جہانگیر نے لکھا ہے (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵ پر)

فرشتہ نے ناصرالدین کو اس الزام سے بری کرنے کی یوں کوشش کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "اس جرم کے ثبوت میں واقعات نہیں پیش کیے گئے اور نہ کسی ایسے سبب کا پتا چلتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوا ہو کیونکہ اس کی ولی عہدی کا اعلان باپ کی مرضی سے ہوا تھا اور بغیر کسی کشیدگی کے وہ حکومت کے کام انجام دیتا رہا۔" مگر ناصر کی قبر اور ہڈیوں کے ساتھ شیر شاہ اور جہانگیر نے جو سلوک خود مانڈو آن کر کیا اور جو صحیح اطلاع ان کو ملی تھی اس سے کسی قسم کا شک و شبہہ ناصر کے مجرم ہونے میں باقی نہیں رہتا۔

غیاث الدین نے چونکہ اپنے سارے عہدِ حکومت میں مانڈو ہی میں قیام کیا لہذا اس نے دارالحکومت کو بہت سی عمارتوں سے زینت بخشی۔ اس بادشاہ کی خوش مذاقی اور عیش پسندی کو دیکھتے ہوئے جہاز محل کی حسین عمارت اور اور ساتھ کے خوش نما مکانات کی تعمیر بے تکلف اسی سے منسوب کی جا سکتی ہے۔

ناصرالدین نے اپنے شاہِ مالوہ ہونے کا اعلان ۲۷ ربیع الثانی ۹۰۶ھ (۲۰ نومبر سنہ ۱۵۰۰ء) کو کیا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی خانہ جنگیوں کا ایک

(بقیہ صفحہ ۲۳) "کہتے ہیں کہ جب شیر شاہ افغان اپنے عہدِ حکومت میں ناصرالدین کی قبر پر آیا تو اس نے باوجود اپنی وحشی فطرت کے ناصرالدین کی بالینِ تربت پر اس کے شرمناک افعال کی وجہ سے لکڑیاں مارنے کا حکم دیا۔ میں بھی جب اس کی قبر پر گیا تو کئی ٹھوکریں ماریں اور اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ اس کی قبر کھود کر اس کی ناپاک لاش کو آگ میں ڈالا جائے لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ آگ نور ہے۔ یہ اچھا نہ ہوگا یہ نجس جسم جلا کر نورِ خدا کو ناپاک کیا جائے اور یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ ممکن ہے کہ جلانے سے اس کے عذاب میں کمی ہو جائے لہذا حکم دیا کہ اس کی شکستہ ہڈیاں مع اس کے بوسیدہ اعضا کے نربدا میں ڈال دی جائیں" (توزک جہانگیری اور بیورج۔ ۲۔ ۳۶۷۔ لہ برگس۔ ۴۔ ۲۴۱۔ اس بادشاہ کے سکّوں کا (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵ پر)

سلسلہ شروع ہوگیا جن میں اکثر امرا شامل تھے۔ ان میں چندیری کا حاکم شیر خاں، ایرج کا سکندر خاں اور مندسور کے مہابت خاں نے مل کر بادشاہ کے خلاف لشکر کشی کی لیکن باغیوں کو شکست ہوئی۔ شیر خاں اور سکندر خاں قتل ہوئے۔[1] ۹۰۸ھ (۱۵۰۲ء) میں کچھ مشکلات کھچواڑہ میں پیدا ہوئیں اور وہاں بادشاہ نے بذاتِ خود لشکر کشی کی اور باقی راجپوتوں[2] کو سزا دی۔ ۹۰۹ھ (۱۵۰۳ء) میں اس نے چتوڑ کی جانب حملہ کیا جہاں رانا نے اس کو روپیہ نذر کیا اور ایک راجپوت راج کماری[3] سے شادی کی جس کو شہزادی چتوڑ کا خطاب عطا کیا۔

محمود خلجی کے عہد سے خاندیس کے حکمراں شاہانِ مالوہ کے مطیع تھے چنانچہ ناصر الدین نے ایک بڑی فوج احمد نظام شاہ بحری کو پسپا کرنے کے لیے روانہ کی جس نے خاندیس کے حاکم داؤد خاں کے خلاف لشکر کشی کی تھی لیکن اس سے قبل کہ مالوے کی فوج اپنی منزلِ مقصود تک پہنچے احمد نظام شاہ، احمد نگر واپس چلا گیا اور برہانپور میں ناصر الدین کا نام خطبے میں پڑھا گیا۔[4]

بادشاہ نے سلطنت میں انتظام قائم رکھا لیکن شراب کا دیوانہ تھا اور اکثر حالتِ شراب نوشی میں ظالمانہ افعال سرزد ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک دن جبکہ وہ عالمِ مدہوشی میں ایک حوض کے کنارے لیٹا ہوا تھا اس میں گر پڑا۔ چار کنیزوں نے جو وہاں کھڑی تھیں خود اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اس کو باہر نکالا اور اس کا بھیگا ہوا لباس اتار کر دوسری پوشاک پہنائی۔

(بقیہ صفحہ ۲۴) سجع یہ ہے:- الواثق بالصمد لم یزل ابو المظفر ناصر شاہ بن غیاث شاہ الخلجی
فہرست رائٹ۔ ۲۔ ۲۵۳۔

[1] برگس۔ ۴۔ ص ۲۴۱-۲ [2] ایضاً۔ ۴۔ ص ۲۴۳۔ [3] یہ راجا جیون داس کی لڑکی تھی۔
[4] برگس

نشہ اترنے کے بعد اس نے دردِ سر کی شکایت کی۔ ان کنیزوں نے اس کے حوض میں گرنے کا ماجرا اس کو سنایا اور دردِ سر کو اس کا سبب قرار دیا۔ بادشاہ کو سخت غصہ آیا اور یہ سمجھ کر کہ ان کنیزوں نے محض اس کی مےخواری پر لعنت ملامت کرنے کے لیے یہ قصہ اپنے دل سے گھڑ لیا ہے تلوار کھینچ لی اور باوجود ان کی التجاؤں کے ان کو قتل کر دیا۔ حالانکہ انھوں نے اس کے اتارے ہوئے بھیگے کپڑے بھی پیش کیے[1]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آخری زمانے میں پدر کُشی کے وبال نے اسے گھیر لیا اور وہ خود اپنے لڑکوں کی جانب سے مشکوک رہنے لگا۔ یہ احساس اتنا نمایاں ہوا کہ شہزادہ شہاب الدین ولی عہد باپ سے خوف زدہ ہو کر دہلی چلا گیا اور پھر باپ نے ہر چند سمجھایا مگر اس نے واپس آنے سے انکار کر دیا[2]۔

۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں ناصر الدین کا انتقال اس تیز بخار سے ہوا جس میں غالباً وہ اپنی بدعادتوں کی وجہ سے مبتلا ہو گیا تھا[3]۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ بادشاہ نے مرنے سے پیشتر توبہ استغفار کی اور سلطنت کا وارث اپنے تیسرے بیٹے محمود کو مقرر کیا[4]۔

ناصر الدین کو تعمیر کا شوق تھا اور اس نے اکبر پور[5] میں نہایت شاندار محل

---

[1] برگس ۴ ص ۳-۲۴۲، ۱، الیٹ ۴ ۳۵۰ اور روجرس اور بیورج ۲ ص ۳۶۷ [2] برگس ص ۲۴۴ [3] "واقعاتِ جہانگیری" میں لکھا ہے کہ ناصر الدین ڈبو دیا گیا الیٹ ۴ ۳۵۰ [4] فرشتہ جلد ۲ ص ۱۸ — ۵۱۷ [5] کیمبل اجے۔ بی۔ آر اے۔ ایس اکبر پور کا قیاس اسی نام کے ایک گاؤں پر کرتا ہے جو مانڈو سے ۱۵ میل دور نربدا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے لیکن بارنس اس کے متعلق لکھتا ہے "اس کی ٹھیک جگہ دریافت کرنا مشکل ہے۔ یہ درست ہے کہ یہاں کھنڈر ہیں جو بظاہر کبھی قلعہ ہوگا، لیکن ان میں نہ تو شان و شکوہ کے آثار نظر (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۲۷ پر)

تعمیر کرایا کہ جو بقولِ فرشتہ "جو دیکھتا بیحد تعریف کرتا"، ریوا کنڈ کے نزدیک بھی وہاں کا خوب صورت محل اسی نے بنوایا جس کو اب باز بہادر کے نام سے منسوب کرتے ہیں[5]۔

۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں سلطان محمود دوم کی بڑی شان و شوکت سے تاجپوشی ہوئی۔ اس موقع پر سات سو ہاتھی جن پر مخملی ہودے کسے تھے جلوس[52] میں شامل تھے لیکن تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے خلاف سازشیں ہونے لگیں اور اس کے حریف شہزادوں کی بادشاہت کا اعلان کیا گیا۔ دہلی کے سلطان سکندر لودی[53] اور مظفر شاہ دوم گجراتی نے محمود کے بڑے بھائی صاحب خان کا ساتھ دیا صاحب خان نے محمد دوم[54] کا لقب اختیار کیا۔ ادھر حاکم خاندیس نے شہاب الدین کی اعانت کی اور جب شہاب الدین کا انتقال ہو گیا تو اس کے لڑکے کو تخت کا حقدار قرار دے کر ہوشنگ دوم[55] کا لقب دیا اور اس کی بادشاہی کا اعلان کیا ان فسادوں میں ایک راجپوت سردار میدانی رائے نے محمود کی بڑی خدمت کی

(بقیہ صفحہ ۲۶) آتے ہیں نہ مانڈو سے یہ کوئی مناسبت رکھتے ہیں علاوہ ازیں کچھواڑے کا ملک مانڈو کے شمال میں بہت دور واقع ہے۔ راگھوگڈھ کے رئیس کچھواڑے کے قدیم راجپوتوں کی اولاد ہیں جنھوں نے شاہانِ مالوہ کو بہت پریشان کیا تھا" پارنس کا اعتراض صحیح معلوم ہوتا ہے اور اکبر پور کے مقام کا پتا کچھوارے کے علاقے میں لگانا چاہیے

[51] ہندستانی اسلامی کتبات ۱۰-۱۹۰۹ ص ۲۴ [52] برگس ۴ ص ۲۴۶۔ [53] سکندر لودی مالوہ اصل میں خود حاصل کرنا چاہتا تھا چنانچہ اس کے بعض حکام نے اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کی جس کے سبب سے ان میں اور صاحب خان کی جماعت میں نا اتفاقی ہو گئی اور سکندر کے عہدہ داروں کو دہلی واپس جانا پڑا۔ بیلے ص ۱۵۲ اور برگس جلد ۴ ص ۶-۱۵۲

[54] محمود دوم کے تانبے کے سکّے مختلف عجائب خانوں میں محفوظ ہیں۔ فہرست رابیٹ ۲ ص ۲۵۹ [55] برگس ۴-۲۵۰

اور بادشاہ کو اپنی مٹھی میں کر لیا[1]۔ میدنی رائے کا اقتدار بڑھتے بڑھتے نہایت خطرناک ہوگیا اور بادشاہ کو مجبوراً مظفر شاہ دوم[2] گجرات کے پناہ لینی پڑی جس نے محمود کے ساتھ نہایت فیاضانہ سلوک کیا اور میدنی رائے کو نکال باہر کیا اور محمود ہی کو مالوے کے تخت پر بٹھایا۔ یہ کام[3] نہایت کامیابی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا لیکن محمود نے مظفر شاہ دوم کے جانشین بہادر شاہ کے عہد میں اس کے حریف چاند خاں سے سازش کی اور وہ ناراض ہوگیا۔ بہادر شاہ نے مانڈو کی جانب لشکر کشی کی اور قلعے کا محاصرہ کر کے ۹ رشعبان ۹۳۲ھ (۲۱ رمئی ۱۵۲۶ء)

---

[1] برگس ص ۶۲-۲۴۷ اور بیلے ص ۶۱-۲۵۵۔ [2] برگس [3] برگس ۴، ۶۲، ۲۵۷ بیلے (گجرات) ص ۶۱-۲۵۴ اور ایلیٹ جلد ۴- ص ۳۸۶۔ "مرأتِ سکندری" نے اس دعوت کا ذکر نہایت شگفتہ طریقے سے کیا ہے جو محمود نے مظفر شاہ کو دی تھی، وہ لکھتا ہے "۱۱ر صفر کو سلطان مظفر شاہ قلعے میں تشریف لائے اور شہر کے تمام لوگ چھوٹے بڑے، عورت مرد، جوق جوق اس کو دیکھنے آئے بہت سے دیواروں اور کوٹھوں پر کھڑے تھے اور سب شکر گزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ سلطان محمود نے اس کی خاطر تواضع بڑی دھوم دھام سے کی۔ دعوت کے بعد وہ اس کو محل دکھانے کے لیے گیا۔ یکایک وہ ایک عمارت میں داخل ہوئے جس میں ایک چوک تھا اور جس کے چاروں طرف رنگین و آراستہ کمرے تھے۔ جیسے ہی وہ درمیان میں پہنچے سب کمروں کے دروازے کھل گئے اور سلطان محمود کی عورتیں نکل آئیں وہ نہایت خوب صورت لباس و زیور پہنے تھیں اور حوریں اور پریاں معلوم ہوتی تھیں۔ وہ طاؤسانِ فردوس کی طرح آئیں اور کشتیوں میں جواہر و زیورات طلائی سلطان مظفر کے لیے لائیں سلطان مظفر نے جب ان کو دیکھا تو کہا: "نامحرم کو دیکھنا گناہ ہے" سلطان محمود نے جواب دیا کہ وہ (عورتیں) اور جو کچھ اس کا ہے وہ سب سلطان مظفر کی نذر ہے۔ آخر الذکر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور التجا کی کہ عورتیں پردے میں واپس چلی جائیں وہ سب ایک لمحے میں پریوں کی طرح نظر سے روپوش ہوگئیں" بیلے ص ۱-۲۶۰۔

کو مانڈو فتح کر لیا[1]۔ محمود قید ہوا اور چمپانیر کے قلعے میں نظر بند کیا گیا لیکن راستے میں فوج کے وہ دستے جو محمود کو لینے جا رہے تھے ان پر بھیلوں نے حملہ کر دیا اور گجراتی سپہ سالار آصف خاں نے اس شک میں کہ یہ حملہ محمود کی رہائی کے لیے کیا گیا ہے بادشاہ اور اس کے لڑکے کے قتل کا حکم دے دیا[2]۔ یہ واقعہ ۱۴ شعبان ۹۳۲ھ (۲۶ مئی ۱۵۲۶ء) کو ہوا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت مالوہ گجرات میں شامل ہو گئی۔

محمود دوم بہادر باہمت آدمی تھا لیکن نہایت ضعیف الاعتقاد اور انتظامی معاملات میں غیر دور اندیش تھا یہی خامیاں اس کی تباہی کا سبب ہو گئیں[3]۔

مانڈو کی عمارتوں میں دو عمارتیں "گدا شاہ کا گھر" اور "گدا شاہ کی دکان"[4] غالباً محمود دوم کے عہد میں میدنی رائے نے تعمیر کرائیں جو واقعی مالوے کا حکمران بنا ہوا تھا۔ ان دونوں عمارتوں میں ایک شاہی احاطے میں ہے اس میں ایک مرد اور عورت کی تصویریں ہیں جو میدنی رائے اور اس کی بیوی کی خیال کی جاتی ہیں[5]۔

ایک عمارت جس کا نام دریا خاں کا مقبرہ ہے غالباً محمود ہی کے زمانے میں تعمیر کی گئی کیونکہ اس کے دربار میں ایک افسر دریا خاں[6] تھا۔ مالوہ ۹۴۱ھ (۱۵۳۴ء) تک گجرات کا ماتحت رہا۔ ۱۵۳۴ء میں ہمایوں نے قلعۂ مانڈو اس طرح فتح کیا کہ تاراپور دروازے کے پاس اپنی فوج کو سیڑھیوں اور رسوں کے ذریعے سے اوپر چڑھا دیا۔ سلطان بہادر قلعے کے اندر محصور و محفوظ آرام سے سو رہا تھا۔

---

[1] برگس ۔۴۔ ۵۔۲۶۵ [2] برگس ۴۔۲۶۹۔ محمود دوم دوھاد میں تالاب کے کنارے دفن کیا گیا۔ برگس۔ ص ۶۸۔ ۲۴۶ [4] "شاہ" ظاہرا ہندی لفظ ساہ سے بنا ہے جس سے ساہو (ساہوکار) کا لقب نکلا ہے۔ فارسی تحریروں میں یہ اصطلاح اکثر "شہ" لکھی جاتی ہے۔ اسی سے جدید لقب سیٹھ اختراع ہوا ہے [5] اس کا آیندہ اوراق میں ذکر آئے گا [6] برگس ۔۴۔ ص ۲۶۷ اور بیلے ص ۳۴۹

شاہی فوج نے دیواروں سے کود کر قلعے کے دروازے کھول دیے اور اپنے گھوڑے اندر لے آئے۔ ملو خاں جو سابقہ خلجی حکومت کا ایک سردار تھا اس نے باز بہادر کو بیدار کیا اور وہ چند ملازمین کو لے کر ہمایوں کی فوج پر حملہ کرنے کے لیے چھپتا پھر ماندو کے بالا حصار سونگڈھ تک پہنچ گیا اور اس نے اپنے گھوڑوں کو کھڑی چٹان سے رسوں میں بندھوا کر اتروا دیا اور چمپانیر[1] کی راہ لی۔ الغرض ہمایوں مانڈو میں مقیم ہوا۔ اس نے صوبے کو باغیوں سے پاک کیا، گجرات کے مفتوحہ علاقے کے ملکی معاملات طے کیے اور دار السلطنت کے قرب وجوار کی بغاوتوں[2] کو ٹھنڈا کیا لیکن جب وہ آگرہ واپس آگیا تو ملو خاں نے وہ ملک جو نربدا اور قصبۂ بھیلسہ کے درمیان واقع ہے دہلی کے حکام سے بارہ مہینے تک لڑ کر واپس لے لیا اور مانڈو میں قادر شاہ کا لقب اختیار کر کے ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء) خود بادشاہ ہو گیا۔[3] اس نے مالوے پر تقریباً چھ برس تک حکومت کی۔ شیر شاہ نے جو دہلی کا بادشاہ ہوا تھا مانڈو[4] پر حملہ کیا۔ قادر شاہ یہ دیکھ کر کہ فوج کے مقابلہ کرنے کی قوت اس میں نہیں ہے شیر شاہ کے رحم کا خواستگار ہوا لیکن شیر شاہ نے اپنے وزیر اور عزیز شجاع خاں کو بحیثیت حاکم کے مقرر کیا اور وہ علاقہ جو اجین اور سارنگ پور[5] کے چاروں طرف ہے اس کے سپرد کیا۔

---

[1] ایلیٹ ۴۔ ص ۱۴ اور برگس ۴۔ ص ۲۷۱۔ [2] ایلیٹ ۴۔ ص ۱۵۔ [3] برگس ۴۔ ص ۲۷۱
مرآتِ سکندری کے بموجب ملو خاں کو قادر شاہ کا لقب سلطان محمود سوم والیٔ گجرات (۱۵۳۷ء تا ۱۵۵۴ء) نے اپنے وزیر عماد الملک کی سفارش سے عطا کیا یہ وزیر ملو کا بڑا دوست تھا۔

[4] برگس ۴۔ ص ۲-۲۷۱ فرشتہ شیر شاہ کے حملۂ مانڈو کے متعلق رقمطراز ہے "تخت نشین ہونے کے فوراً ہی بعد قادر شاہ کو ایک فرمان ملا جس کی پیشانی پر مہر و طغرا تھا اور جس کو شیر شاہ پوربی افغان بادشاہ بنگال نے بھیجا تھا۔ مضمون یہ تھا کہ (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۳۱ پر)

شجاع خاں ایک ماہر سپاہی تھا اور اس نے نہایت کامیابی سے اس بغاوت کو رفع کیا جو قادر شاہ نے اپنی ریشہ دوانی سے مالوہ میں برپا کی تھی شجاع خاں نے مالوہ میں ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) تک حکومت کی۔ کچھ عرصے کے لیے سلیم شاہ پسرِ شیر شاہ نے ناچاقی کی وجہ سے اس سے حکومت لے لی اور عیسیٰ خاں کو اس کے بجائے مقرر کیا لیکن کچھ ہی زمانے کے بعد اس کو دوبارہ مقرر کیا گیا فرشتہ لکھتا ہے کہ "جب ہمایوں نے تختِ دہلی دوسری بار حاصل کیا اس وقت شجاع خاں اپنی خودمختاری کا اعلان کرنے والا تھا اور قریب تھا کہ اپنا سکہ بھی چلا دے لیکن بدبختی نے اس کے ہونٹوں سے جامِ عیش چھین لیا اور موت نے اس کو فنا کا پیالہ عطا کیا"[1]

شجاع خاں[2] نے زندگی میں اپنا ملک اپنی اولاد یعنی دولت خاں ملک بایزید

(بقیہ صفحہ ۳۰) ہمایوں بادشاہ اس پر حملہ کرنے کے لیے آرہا ہے شاہ مالوہ کو چاہیے کہ وہ آگرے کی جانب فوج کشی کرے تاکہ شاہِ دہلی سراسیمہ و بدحواس ہو اور اس کو (شیر شاہ) یہ موقع مل جائے کہ وہ بادشاہ کی سلطنت پر کارگر حملہ کر سکے۔ یہ فرمان ملتے ہی قادر شاہ کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے اپنے میر منشی کو تاکید کی کہ وہ جو فرمان لکھے اس کی پیشانی پر قادر شاہ کی مہر ثبت کرے (اس سے شیر شاہ پر اپنی برتری کا اظہار تھا) جب شیر شاہ کو یہ جواب ملا تو اس نے مہر پھاڑ کر اپنی تلوار کی نوک پر رکھی اور کہا "انشاءاللہ اگر میں کبھی قادر شاہ سے ملا تو اس گستاخی کا مزا چکھاؤں گا جو اس نے اپنی مہر میرے نام کے خط پر لگا کر کی ہے"۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس نے مالوے پر لشکر کشی کی۔ [1] برگس ص ۲۷۵ -

[2] شجاع خاں کو شجاعت خاں اور شجاع دل خاں بھی مورخوں نے لکھا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ رفاہِ عام کے کاموں میں جن سے شجاع خاں کا نام زندہ ہے قصبۂ شجاول پور ہے جو اجین کے قریب آباد ہے (برگس ۴۔ ص ۲۷۶-۱ اور تاریخ الفی (ایلیٹ جلد ۵ ص ۱۶۸) -

اور مصطفےٰ خاں میں تقسیم کر دیا۔ شجاع خاں کی وفات کے بعد ملک بایزید نے دغابازی سے اپنے بھائی دولت خاں کو قتل کر دیا۔ اس نے مالوہ کے خود مختار بادشاہ کی حیثیت اور سلطان باز بہادر کا لقب ۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء) میں اختیار کیا۔[۱]

باز بہادر ایک دلاور بادشاہ تھا اور اس نے مالوہ کے اکثر قصبوں کو جو پیشتر خود مختار ہو گئے تھے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا لیکن بعد ازاں اس نے رانی درگاوتی کے ہاتھوں ایسی ذلیل شکست کھائی کہ جنگ سے توبہ کر لی۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں علم موسیقی مالوے میں حدِ کمال کو پہنچ چکا تھا اور باز بہادر اس کی تحصیل واشاعت میں ہمہ تن کوشاں تھا۔ اس کا عشق روپ متی سے جو اس زمانے کی ایک مشہور طوائف تھی اتنا زبان زدِ خلائق ہوا کہ گیتوں کی صورت میں آیندہ نسلوں تک پہنچا ہے۔[۲] مالوے کی یہ حالت سن کر اکبر نے ۹۶۸ھ (۱۵۶۱ء) کے آخر سال میں ادھم خاں کو اس ملک پر لشکر کشی کر کے قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ نظام الدین مصنف طبقاتِ اکبری نے حملے کا حال مفصل لکھا ہے اور اسی کا اقتباس یہاں لکھا جاتا ہے" باز بہادر علم موسیقی و ہندی شاعری میں یکتائے روزگار تھا وہ اپنا وقت زیادہ ماہرینِ موسیقی اور مغنیوں کی صحبت میں صرف کرتا۔ شاہی فوج سارنگ پور سے صرف دس کوس پر تھی جب ادھم خاں نے ہراول کا ایک دستہ ان خندقوں کی جانب روانہ کیا جو باز بہادر نے اپنی

---

[۱] برگس جلد ۴۔ ص ۲۷۶۔ [۲] سٹرال۔ ایم کرمپ کے حال میں ایک فارسی نسخے کا پتا لگایا ہے جس میں روپ متی کے حالات زندگی درج ہیں اور جو انھوں نے مع ان گانوں کے جو روپ متی سے منسوب ہیں انگریزی میں ترجمہ کیے ہیں۔ "لیڈی آف دی لوٹس" اکسفورڈ پریس ۱۹۲۶ء

فوج کے چاروں طرف ہنوائی تھیں مختلف کوششیں اس کو ان حدود سے باہر لانے کے لیے کی گئیں اور شاہی فوجیں اس کے محاصرے کے لیے جمع ہونے لگیں۔ اس وقت باز بہادر نے غفلت ترک کی اور جنگ کے لیے باہر قدم نکالا لیکن اس کی فوج کے افغان امرا منحرف ہو گئے اور وہ بھاگنے پر مجبور ہوا۔ روپ متی اس کی محبوبہ بیوی جو گایا کرتی تھی، دوسری بیویاں اور اس کا سب خزانہ شاہی فوجوں کے ہاتھ لگا۔ اس وقت جب کہ بھاگنے والے بھاگ رہے تھے باز بہادر کے ایک خواجہ سرا نے روپ متی کو تلوار سے زخمی کر دیا تاکہ وہ دشمنوں کے ہاتھ نہ لگے اور جب وہ ادھم خاں کے سامنے آئی تو اس نے زہر کھا کر خودکشی کر لی"[1]

اس فتح کے بعد ادھم خاں دہلی واپس بلا لیا گیا اور اس کے بجائے پیر محمد خاں حاکم مالوہ مقرر ہوا۔ ۱۵۶۱ء میں باز بہادر نے خاندیس کے میران مبارک خاں کی مدد سے پیر محمد کو زبردست شکست دی وہ اس جنگ میں قتل ہوا اور مالوے سے مغل فوج نکال باہر کی گئی[2]۔ اکبر نے اس بربادی کا حال سن کر باز بہادر کو سزا دینے کے لیے عبداللہ خاں کو مقرر کیا اور اس نے مالوے پر ۹۶۹ھ (۱۵۶۲ء) کے آخیر میں لشکرکشی کی۔ باز بہادر جو مغل فوجوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا گونڈواڑا کی پہاڑیوں میں چلا گیا۔ بعد میں اس نے میواڑ کے رانا اودے سنگھ کے یہاں پناہ لی جہاں سے وہ گجرات گیا لیکن اس کے بعد اکبر سے رحم کا خواستگار ہوا۔ شہنشاہ نے اس کو منصب[3] دو ہزاری عطا کیا۔

مانڈو کی یادگار عمارتیں جو باز بہادر سے منسوب کی جاتی ہیں "ریوا کنڈ"[4]

---

[1] ایلیٹ جلد ۵ ۱-۲۷۰، فرشتہ نے یہ واقعہ نہایت شاعرانہ جوش و خروش سے بیان کیا ہے۔ [2] برگس ۲-۹-۲۷۸ [3] ایلیٹ جلد ۵ ص ۶-۲۷۵ اور آئین اکبری مترجمہ بلوگ مین جلد ۱۔ ص ۴۲۸۔

[4] ریوا کنڈ کے متعلق حسب ذیل قصہ بیان کیا گیا ہے "باز بہادر ایک دن (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۴۴ پر)

اس کے پاس کا محل اور وہ شہ نشین ہیں جو جنوبی پہاڑ پر تعمیر کیے گئے تھے اور اس کی بیوی روپ متی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کتبوں کے بموجب جو دو آخر الذکر عمارتوں پر درج ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو پہلے بادشاہوں نے تعمیر کیا تھا اور

(بقیہ صفحہ ۳۳) اس جنگل میں شکار کھیل رہا تھا جو نربدا کے داہنی جانب ہے۔ وہ اپنے ہمراہیوں سے آگے نکل کر بڑی تندہی سے شکار کا پیچھا کر رہا تھا کہ نزدیک جنگل کے راستے سے دل کش نغمات کے سیلاب نے اس کو متوجہ کیا۔ وہ آواز کے سہارے فوراً اس مقام تک پہنچا جہاں برگد کے درخت کے نیچے ایک ہندو دوشیزہ بیٹھی گا رہی تھی۔ درخت۔ ہرن اور پرندے اس کی آواز پر وہاں کھنچ آئے تھے۔ اس کے حسن نے اس کو مسحور کر دیا۔ اور اس کے لاجواب گانے نے متحیر۔ اس کی گفتگو نے اس کی آتشِ عشق کو بھڑکا دیا۔ اس نے اس دوشیزہ کا دل اور خود اس کو حاصل کرنا چاہا دل تو فوراً اس کا ہو گیا لیکن وہ خود اس کی نہ ہو سکی کیونکہ وہ اس پاک نسل کی بیحرمتی نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے وہ پیدا ہوئی تھی۔ اس نے بادشاہ کی التجا کا یہ جواب دیا "جب نربدا مانڈو میں ہو کر بہے گی اس وقت میں تمھاری بن جاؤں گی۔ اس سے پہلے نہیں" باز بہادر نے تہیہ کر لیا کہ دریا کو آوازِ عشق کی اطاعت کرنی ہوگی اور پہاڑوں کی بلندی پر آنا پڑے گا اس نے اپنی سلطنت کے تمام لوگوں کو جمع کیا کہ وہ تیشے لے کر آج طاقت کی آزمایش کریں۔ دریا کا دیوتا جلالِ عشق کے مقابلے سے خوف زدہ ہو کر ان لوگوں کے روبرو ایک دیو کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس کا ماتھا بادلوں میں چھپا تھا۔ وہ زور سے چیخا "ٹھہرو۔ اپنی حماقت کی کوششوں سے باز آؤ۔ لو اس صلے کو قبول کرو جس کے تم مستحق ہو۔ مانڈو جاؤ اور اس مقام پر جہاں سے ہمارا پانی نظر آئے وہاں ہماری پاک تمرس تلاش کرو۔ جہاں وہ دستیاب ہو وہاں کھود دو۔ اس کے نیچے تم کو ایک چشمہ ملے گا جو ہمارا معاون اور ہماری الوہیت کا ایک جزو ہے۔ وہاں اپنی بیوی کو رکھو کیونکہ اس نے قسم کھائی ہے کہ وہ اسی دریا کے کنارے رہے گی جس کے ساحل پر وہ پیدا ہوئی ہے" بادشاہ نے اس حکم کی تعمیل کی (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۳۵ پر)

بازبہادر نے ان میں محض اضافہ کیا ہے۔

اکبر بادشاہ اپنے عہد میں کم از کم چار مرتبہ مانڈو آیا۔ پہلے ۱۵۶۳ء میں جب ادھم خاں کی طرف سے بغاوت کے آثار ظاہر ہوئے تو اس کو سزا دینے کے لیے بذاتِ خود لشکر کشی کی۔ شاہی فوج ذوالحجہ کی چاند رات ۹۹۱ھ کو مانڈو پہنچی۔ اکبر کو یہاں وہ دلی مسرت حاصل ہوئی جو اس مقام کی روایات سے وابستہ ہے کیونکہ اس نے ایک فرمان، مبارک شاہ والیٔ خاندیس کو بھیجا، حکم تھا "کہ اپنی لڑکیوں میں سے کسی ایک لڑکی کو جو شہنشاہ کی خدمت کے لائق ہو حاضر کرے"۔ مبارک شاہ کو اس پیغام سے نہایت مسرت ہوئی۔ اس نے ایک لڑکی کو مناسب ساز و سامان و خدام کے ہمراہ شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا[۱]۔

اکبر مانڈو میں دوسری مرتبہ ۱۵۹۲ء میں آیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اس کا لڑکا مراد مالوے کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ اس نے دکن جاتے ہوئے راستے میں قیام کیا۔

وہ تیسری اور چوتھی مرتبہ دکن کی مہموں کے سلسلے سے آیا اور اس کی آمد کا مستند اندراج کتبوں کی صورت میں موجود ہے (مورخہ ۱۰۰۸ھ اور ۱۰۰۹ھ مطابق ۱۶۰۰ء و ۱۶۰۱ء) یہ دونوں کتبے اس خوب صورت محل کی دیواروں پر کندہ ہیں جسے نیل کنٹھ محل کہتے ہیں اور جسے شاہ بداق خاں صوبہ دارِ مانڈو نے تعمیر کرایا[۲]۔

(بقیہ صفحہ ۳۴) اس کو وہ تمرس اور چشمہ مل گیا۔ اس نے تالاب بنوایا اور اس کے نزدیک ایک محل تعمیر کرایا۔ ایک نہایت خوب صورت نالی بنوائی جس سے چشمے کا پانی محل کے حماموں میں پہنچتا ہے" (ملاحظہ ہو جے۔ بی۔ آر اے۔ ایس۔ ص ۳۷۱)

[۱] ایلیٹ۔ جلد ۵۔ ص ۹۰-۲۸۹ [۲] بداق خاں ۱۵۶۳ء میں مانڈو کا صوبے دار مقرر کیا گیا۔ شہنشاہ جہانگیر تزک میں (ص ۲، ۳۷۲) نیل کنٹھ دیکھنے کے بعد (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۳۶ پر)

اکبر کے عہد حکومت کے دو کتبے مانڈو میں اور ہیں۔ ایک میں مرمت کا ذکر ہے جو تاراپور دروازے[۱] کے نزدیک شہنشاہ کی آمد کے وقت کی گئی تھی اور دوسرا محمود خلجی کی مرمتِ قبر کے متعلق ہے۔ اس کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

مالوے کے خلجی خاندان کی تباہی کے ساتھ مانڈو کی عظمت بھی رخصت ہوتی نظر آئی لیکن کچھ عرصے کے لیے سنبھل گئی۔ اول تو باز بہادر کی چھ سال کی حکومت میں اور بعد ازاں عہد جہانگیری میں جب شہنشاہِ جہانگیر قلعے میں تشریف لائے اور اس کی قدیم عمارتوں کی مرمت کی گئی اور نئی عمارتیں تعمیر ہوئیں[۲]۔ جہانگیر نے مانڈو میں سات مہینے سے زیادہ قیام کیا۔ وہ ۶ مارچ ۱۶۱۷ء کو وہاں پہنچا اور اسی سال ۲۴ اکتوبر کو وہاں سے روانہ ہو گیا[۳]۔ اس زمانے میں مختلف شاندار جشن مانڈو میں ہوئے جس کا ذکر شہنشاہ کی تزک میں اور سفیر سر ٹومس رو کے حالات میں موجود ہے۔ یہ سفیر شہنشاہ کے ہمراہ مانڈو آیا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۳۵) تحریر کرتا ہے" امرداد کی تیسری کو (جولائی ۱۶۱۷ء) میں خواتین حرم کے ہمراہ نیل کنٹھ دیکھنے کے لیے روانہ ہوا جو قلعۂ مانڈو کے بہترین مقامات میں سے ہے۔ شاہ بداق خاں جو میرے والد بزرگوار کے معتبر امرا میں تھے۔ انھوں نے یہ دل کش اور فرحت افزا محل اس زمانے میں تعمیر کیا جب یہ صوبہ بطورِ جاگیر ان کے پاس تھا (۱۵۷۲ء تا ۱۵۷۳ء) میں نیل کنٹھ میں ایک گھڑی رات تک رہا اور اس کے بعد سرکاری اقامت گاہ میں واپس آ گیا"۔

[۱] ہندستانی اسلامی کتبات ۱۵-۱۹۰۹- ص ۱۹-

[۲] روجرس اور بیورج- جلد دوم- ص ۴-۳۶۳- جہانگیر نے مرمت اور نئی عمارتوں پر تین لاکھ روپیہ صرف کیا۔ [۳] "کرے" کے "حالات سفر" جلد ۹ ص ۳۲۵ اور ایلیٹ ۶- ص ۳۷۷

شب برات کی دعوت کے متعلق شہنشاہ لکھتا ہے۔ "جمعرات کی شام کو بتاریخ ۲۶ مطابق ۱۴ شعبان جب کہ شبِ برات ہوتی ہے میں نے نورجہاں بیگم کے محل کے ایک حصّے میں جلسہ کیا جو بڑے بڑے تالابوں کے وسط میں واقع تھا اور امرا اور اہلِ دربار کو اس دعوت میں مدعو کیا جس کا انتظام بیگم نے کیا تھا میں نے ملازمین کو حکم دیا کہ مہمان منشیات میں سے جو کچھ بھی طلب کریں فوراً پیش ہو۔ بہت سے لوگوں نے شراب طلب کی اور میں نے حکم دیا جو کوئی مے نوشی کرے اپنے منصب اور درجے کے مطابق بٹھایا جائے۔ ہر قسم کے بھنے ہوئے گوشت اور میوے بطورِ گزک چنے گئے وہ ایک عجیب جلسہ تھا۔ سرِ شام چراغ اور قندیلیں تالابوں اور عمارتوں کے چاروں طرف روشن کی گئیں اور ایسا چراغاں ہوا جس کی مثال کہیں نہ ملے گی۔ چراغوں اور قندیلوں کا عکس تالاب میں پڑتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تالاب کی سطح آگ کا میدان ہے۔ غرض نہایت شاندار جشن ہوا اور میخواروں نے خوب پی"[1]

دل افروز بزمے شد آراستہ — بخوبی بدانساں کہ دل خواستہ
فگندند در پیش ایں سبز کاخ — بساطے چو میدانِ ہمّت فراخ
زبس نکہتِ بزم می رفت دور — فلک نافۂ مشک بود از بخور
شدہ جلوہ گر نازنینانِ باغ — رخ افروختہ ہر یکے چوں چراغ

مانڈو میں چونکہ درندوں کا شکار کثرت سے ہے اس لیے شکار کے دل دادہ شہنشاہ نے دل کھول کر شکار کھیلا۔ تزک میں شکار کے حالات اکثر جگہ بیان کیے ہیں جن میں سے ایک کا ذکر یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ ۷ تاریخ کو شکاریوں نے چار شیروں کا پتا لگایا دو ساعت اور تین گھڑی گزرے تھے جب میں

---

[1] روجرس اور بیورج جلد ۲ ص ۳۷۵

شیروں کے شکار کے لیے مع بیگمات کے روانہ ہوا جب شیر نظر آئے تو نورجہاں بیگم نے التجا کی کہ اگر اجازت ہو تو میں ان شیروں کو اپنی بندوق سے شکار کروں۔ میں نے کہا "ایسا ہی سہی" اس نے دو گولیوں میں دو شیر مارے اور باقی دو شیر چار گولیوں میں۔ چشم زدن میں اس نے چار شیروں کو بیجان کر دیا۔ اب تک ایسا شکار نہیں دیکھا گیا تھا کہ ہاتھی کے اوپر ہودے میں سے چھ گولیاں چلائی گئیں اور ایک نشانہ بھی خطا نہ ہوا۔ اسی سبب سے ان چار جانوروں کو بھاگنے یا جست کرنے کا بھی موقع نہ ملا۔ میں نے اس عمدہ نشانے کے صلے میں ایک جوڑی ہیرے کی پہنچی قیمتی ایک لاکھ روپیہ بیگم کو دی اور ایک ہزار اشرفیاں اس پر سے نچھاور کیں[1]"

پہلی ستمبر ۱۶۱۷ء کو جہانگیر کی سالگرہ تھی۔ کیمبل نے حسب ذیل حالات لکھے ہیں جو 'رو' 'ٹیری' اور 'کوریٹ' کے بیانات پر مبنی ہیں" بادشاہ ۴۵ برس کا تھا۔ درمیانہ قد، مضبوط مگر سڈول جسم اور زیتونی رنگ تھا "رو" دستور کے سلام کے لیے حاضر ہوا۔ وہ باز بہادر کے باغات میں جو ریوا کنڈ کے مشرق میں ہیں لایا گیا۔ یہ گھنا باغ اس وقت ایک خوب صورت چمن تھا جس میں ایک مربع تالاب کے چاروں طرف پھول دار درخت تھے۔ چمن کے بیچ میں ایک بہت بڑا شامیانہ نصب تھا۔ اس میں ایک ترازو آویزاں تھی جس میں بادشاہ تولا جانے والا تھا۔ ترازو کے پلے سونے کے تھے جس میں چھوٹے چھوٹے جواہرات مثلاً لعل، فیروزہ وغیرہ جڑے ہوئے تھے اور سونے کی وزنی زنجیروں میں لٹک رہے تھے۔ زیادہ مضبوطی کے لیے ریشمی ڈوریاں اور لگا دی تھیں۔ چاروں طرف امرائے دربار قیمتی قالینوں پر بیٹھے بادشاہ کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ہیروں

---

[1] روجرس و بیورج۔ ص ۳۸۵

لعلوں، موتیوں اور دُوسرے قیمتی جواہرات میں لدا ہوا بڑے کروفر سے آیا۔ اس کی تلواریں اور تخت بھی اتنے ہی بیش قیمت اور شاندار تھے۔ اس کا سر، گردن، سینہ، بازو (کوہنیوں کے اوپر تک)، اور کلائیاں قیمتی جواہرات کی لڑیوں سے مزیّن تھیں۔ ہر ایک انگلی میں دو یا تین قیمتی انگوٹھیاں تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پیر لعل اور ہیروں کی لڑیوں سے جکڑ دیے گئے ہوں۔ یہ لعل اور ہیرے اتنے بڑے بڑے تھے جتنے اخروٹ اور موتی تو بہت ہی غیر معمولی بڑے تھے۔ وہ پلّوں میں سکڑ کر اور عورتوں کی طرح اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے وزن کے برابر تھیلی میں ۹۰۰۰ چاندی کے رُپے دُوسرے پلے میں رکھے گئے اور چھ مرتبہ بدلے گئے۔ اس کے بعد سونا اور قیمتی جواہرات کی تھیلیاں رکھ کر تولا گیا۔ بعد ازاں کنخواب، ریشمی اور سوتی کپڑے، مسالے اور دیگر اشیا سے خورونوش اور مکھن سے۔ سوائے چاندی کے جو غربا کے لیے رکھ لی گئی باقی سب برہمنوں کو تقسیم کر دیا گیا۔ جب تولا جا چکا تو جہانگیر تخت پر جلوہ افروز ہوا اور تشت میں اخروٹ، بادام اور سب قسم کے مسالے اس کے روبرو پیش ہوئے۔ اس کو بادشاہ نے لٹایا اور اس کے امرا ہر طرف لوٹنے لگے۔ رُو نے لوٹ کو خلافِ تہذیب سمجھا بادشاہ نے یہ دیکھ کر کہ وہ الگ کھڑا ہوا ہے اس کو ایک کشتی بھر کے بھیجی جو اس کے لبادے میں ڈال دی گئی۔ اطبا نے بادشاہ کا وزن لکھا اور اس کی ثنا و تعریف کی۔ اب مغل شہنشاہ نے اپنے امرا کے نام کا اور امرا نے اس کا جامِ صحت پیا۔ بادشاہ نے سفیرِ اعلیٰ کے نام کا بھی جامِ صحت نوش کیا۔ اس کے ساتھ بادشاہ خاص عنایت سے پیش آتا تھا اور اس کو ایک طلائی پیالہ عطا کیا تھا جس پر عجیب و غریب میناکاری تھی اور جس میں لعل، فیروزہ اور زمرد جڑے تھے"[1]

---

[1] جے۔ آر۔ بی۔ اے۔ ایس۔ جلد ۲۹ ص ۵-۱۹۴۔ کیمبل نے اس سلسلے میں (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۴۰ پر)

شاہجہاں نے اپنی تشریف آوری سے مانڈو کو دو مرتبہ شرف بخشا۔ پہلی مرتبہ ۲ / اکتوبر ۱۶۱۷ء میں جب اس کے والد کا وہاں قیام تھا اور اس نے شہنشاہِ جہانگیر کو شاندار و گراں قدر جواہرات پیش کیے اور دوسری مرتبہ

(بقیہ صفحہ ۱۰۹) جن تصانیف کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہیں (۱) کیر کے حالاتِ سفر میں (رو) (۹) ۴۳-۳۳۷ (۲) پنکرٹن کے حالاتِ سفر جلد ۸ ص ۳۵ (۳) ٹیری کے حالاتِ سفر ۴۰۳، ۳۷۷

(۴) "کروڈٹیز" از کوریٹ، جلد سوم۔

لہ پنکرٹن کے حالاتِ سفر۔ جلد ۸۔ ص ۳۹۔ واقعاتِ جہانگیری میں اس واقعہ کی تاریخ ۱۱ / شوال ۱۰۲۶ھ ملاحظہ ہو ایلیٹ ۴۔ ۳۵۱۔

سلہ تزک میں (روجرس اور بیورج۔ جلد ۲۔ ص ۴۰۱-۳۹۹) یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

"مبارک شنبہ (جمعرات) ۱۰ / ماہ کو میرے لڑکے شاہجہاں نے اپنا نذرانہ پیش کیا۔ جواہر، اشیائے مرصع، نفیس کپڑے اور نایاب تحائف یہ سب جھروکے کے صحن میں سجائے گئے اور ان کے ساتھ ساتھ ہاتھی اور گھوڑے نقرئی و طلائی ساز و سامان سے آراستہ کھڑے تھے۔ میں اس کو خوش کرنے کے لیے جھروکے سے اتر آیا اور ایک ایک چیز دیکھی۔ ہاں ان میں ایک نفیس لعل تھا جس کو گوا بندر میں میرے لڑکے کے لیے ۲۰۰۰۰۰ روپے میں خرید گیا تھا۔ اس کا وزن ۱۹½ ٹنکہ، ۱ / مثقال ½ ۵ سرخ تھا۔ میرے توشے خانے میں کوئی لعل ۱۲ ٹنکہ سے زیادہ نہ تھا اور اس کی قیمت کے متعلق جوہری متفق تھے۔ نیلم جو عادل خاں نے نذر میں پیش کیا تھا ۶ ٹنکہ، ۷ سرخ وزن میں تھا اور اس کی قیمت ۱۰۰۰۰۰ روپے اندازہ کی گئی۔ میں نے اتنا بڑا اور ایسے اچھے رنگ کا نیلم نہیں دیکھا۔ ایک "چمکوڑا ہیرا" تھا۔ یہ بھی عادل خاں کے یہاں کا تھا۔ اس کا وزن ۱ ٹنکہ ۶ سرخ تھا۔ اس کی قیمت اندازاً ۴۰۰۰۰ روپے تھی۔ یہ نام چمکوڑا یوں ہوا کہ دکن میں ایک پودا "ساگ چمکوڑا" ہے۔ جب مرتضیٰ نظام الملک نے برار فتح کیا تو وہ ایک دن اپنی خواتین کے ساتھ باغ میں سیر کرنے گیا (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۴۱ پر)

۱۶۲۱ء میں جب وہ دربار میں طلب کیا گیا تھا لیکن اس نے قیام مانڈو کو ترجیح دی اور برسات کا موسم وہاں گزارا۔

(بقیہ صفحہ ۱۲) اسی اثنا میں ایک عورت نے چکوڑا کے پودے میں یہ ہیرا پایا اور وہ نظام الملک کے پاس لائی۔ اس دن سے یہ چکوڑا ہیرا کہلاتا ہے اور یہ احمد نگر کے دوران فترات میں موجودہ ابراہیم عادل شاہ کے ہاتھ آیا۔ ایک زمرد تھا جس کو عادل خاں نے پیش کیا تھا۔ یہ ایک نئی کان میں پایا گیا لیکن میں نے ایسے خوب صورت اور ہلکے رنگ کا زمرد پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ علاوہ ازیں دو موتی تھے۔ ایک کا وزن ۶۴ سرخ یا ۲ مثقال ۱۱ سرخ تھا اور اس کی قیمت تخمیناً ۲۵۰۰۰ روپے تھی۔ دوسرے کا وزن ۱۶ سرخ تھا اور لطیف سبک اندامی و مدور شکل کے لحاظ سے عجیب تھا۔ اس کی قیمت کا تخمینہ ۱۲۰۰۰ روپے تھا ایک اور ہیرا قطب الملک کی پیش کش میں تھا۔ اس کا وزن ایک تنگہ اور قیمت ۳۰۰۰۰ روپے تھی۔ ۱۵۰ ہاتھی تھے جن میں سے تین کا طلائی ساز و سامان اور زنجیریں تھیں اور نو کا نقرئی ساز و سامان۔ میرے نجی فیل خانے میں بیس ہاتھی رکھے گئے جن میں پانچ بہت بڑے اور مشہور تھے۔ اول "نور بخت" جس کو میرے لڑکے نے بروز ملاقات پیش کیا تھا اس کی قیمت ۱۲۵۰۰۰ روپے تھی۔ دوسرا "مہی پتی" جو عادل خاں نے پیش کیا تھا اس کی قیمت ۱۰۰۰۰۰ روپے تھی۔ میں نے "درجن سال" اس کا نام رکھا۔ ایک اور ہاتھی جو اس نے پیش کیا اس کا نام "بخت بلند" تھا اور اس کی قیمت ۱۰۰۰۰۰ روپے تھی۔ میں نے اس کا نام "گراں بار" رکھا۔ ایک کا نام قدوس خاں اور پانچویں کا امام رضا تھا۔ یہ قطب الملک نے پیش کیے تھے۔ ہر ایک کی قیمت ۰۰۰۰۰ روپے تھی۔ پھر عرب و عراق کے عمدہ گھوڑے تھے۔ تین کی زین جواہر نگار تھی۔ اگر میں اپنے لڑکے اور دکن کے حکمرانوں کے نذرانوں کا مفصل حال لکھوں تو طول عمل ہوگا۔ جو کچھ میں نے اس کے تحائف میں قبول کیا اس کی قیمت ۲۰۰۰۰ روپے تھی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنی والدہ نور جہاں بیگم کو جو نذرانہ پیش کیا وہ ۲۰۰۰۰ روپے کا تھا اور (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۲۴ پر)

اورنگ زیبؒ کی مانڈو میں آمد کے متعلق کہیں کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں لیکن اس کے عہد کی یادگار ایک کتبہ دروازے پر کندہ ہے جو مانڈو کی پہاڑی کے میدان کے کنارے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ یہیں سے وہ وادی شروع ہوتی ہے جو قلعۂ مانڈو کے چاروں طرف چلی گئی ہے۔[۱]

جب مغلیہ سلطنت میں زوال شروع ہوا تو مرہٹوں نے مالوے پر کئی حملے کیے اور ۱۷۳۲ء میں ملہر راؤ ہلکر نے مانڈو کے مغل صوبہ دار دیا بہادر کے خلاف لشکرکشی کی جس میں صوبہ دار نے بہ مقام ترلا جو دھار سے ۶ میل مغرب میں واقع ہے شکست کھائی اور قتل ہوگیا۔ دوسرا صوبہ دار محمد خاں بنگش اور اس کا جانشین راجا جے سنگھ مرہٹوں کو نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئے اس لیے مرہٹوں کی فتح ۱۷۳۴ء میں تسلیم کرلی گئی اور پیشوا باجی راؤ صوبہ دار مالوہ مقرر ہوا۔[۲] پیشوا نے اپنی تقرری کے بعد انند راؤ پوار کو اپنا نائب مقرر کیا۔ آخرالذکر نے دھار میں قیام کیا جو پنوار کا قدیم دارالسلطنت تھا۔ ۱۷۳۴ء سے مانڈو دھار کے

(بقیہ صفحہ ۱۴) ۶۰۰۰ روپے کے تحائف دوسری ماں اور بیگمات کو پیش کیے۔ میرے لڑکے کا کل نذرانہ ۲۲۶۰۰۰ روپے یا ایران کے سکۂ مروجہ میں ۷۵۰۰۰ یا ۶۸۰۰۰۰ تورانی خانی مروجہ ایسے نذرانے کبھی اس خاندان میں پیش نہیں ہوئے۔ میں اس کے ساتھ خاص توجہ اور عنایت سے پیش آیا۔ درحقیقت یہی لڑکا الطاف وعنایات کا مستحق ہے۔ میں اس سے بیحد خوش و مطمئن ہوں۔ خداوند عالم اس کو عمرِ دراز عطا کرے اور وہ اقبال مند ہو"۔

[۱] ایلیٹ جلد ۷۔ ۳۔ ۳۰۲

[۲] ہندستانی اسلامی کتبات۔ ۷۔ ۱۹۰۹۔ ص ۲۰

پواروں کی ریاست میں شامل ہے۔[1] چونکہ یہ خاندان مالوہ کے قدیم پنوار حکمرانوں کی اولاد ہونے کا مدعی ہے۔ اس لیے مالکم نے یہ برمحل خیال ظاہر کیا ہے:-

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ مرہٹوں کی کامیابی نے مانڈو کو انندراؤ پوار اور اس کی اولاد کا دارالحکومت بنا کر اسی نسل کو بادشاہت پھر عطا کر دی جو سات سو سال قبل اس شہر اور علاقے کی حکومت سے محروم کر دی گئی تھی۔"[2]

---

[1] "وسط ہند" مصنفہ مالکم ص ۸۔

[2] "وسطِ ہند" از مالکم۔

باب سوم

"قدیم عمارتیں"

نلچھا کے خوب صورت گانو سے جو دھار اور مانڈو کے بیچ میں واقع ہے آگے نکل کر سیاح سڑک کے دونوں طرف دیکھے گا کہ زمین اونچے اونچے درختوں اور گھنی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ہے یہاں وہاں شکستہ قبریں نظر آتی ہیں جو ان شہدا کی خاموش یادگاریں ہیں جنھوں نے اپنا خون اس دیو پیکر قلعے کو فتح کرنے میں بہایا تھا فصیل کی سیاہ قدیمی دیواریں دور ہی سے نظر آنے لگتی ہیں اور سیاح جب قلعے کے نزدیک پہنچتا ہے تو کیکڑا کوہ کی عمیق وادی دیکھ کر اسے حیرت اور ہیبت ہوتی ہے۔ یہ پُرشکوہ نالہ مانڈو کی پہاڑی کو مشرق و مغرب میں گھیرے ہوئے ہے۔ نیماڑ کے میدان میں جنوب کی جانب اس کا ڈھال ہے لیکن شمال کی طرف اتنا ڈھال نہیں ہے اسی طرف قلعے کے تعمیر کرنے والوں نے پہاڑی کی چوٹی پر محراب دار اونچی دیوارو کا ایک طولانی سلسلہ قائم کیا اور مختلف مناسب مقامات پر دروازے اور برج بنائے۔

دھار سے ۱۲ میل پر پانچویں اور چھٹے فرلانگ کے پتھروں کے درمیان سڑک نالے میں سے گزرتی ہے جہاں وہ زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اس مقام پر قلعے کی حفاظت کے لیے ایک دروازہ مع فصیل کے تعمیر کیا گیا ہے۔

عالمگیر دروازہ

اسے عالمگیر دروازہ کہتے ہیں کیونکہ ایک تختی پر جو عمارت کے کنارے دیوار میں نصب ہے یہ کتبہ درج ہے کہ وہ عالمگیر کے عہد میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔[لہ] دروازے کے سامنے ایک احاطہ ہے جس میں دو مربع برج دیوار کے دونوں سروں پر بنے ہیں۔ دروازہ محراب دار ہے اور عمارت کی بلندی موجودہ سڑک کی سطح سے کنگوروں کے سرے تک ۴۳ فٹ ہے۔ ڈیوڑھی کا طول ۳۱ فٹ ہے اور عرض ۱۳ فٹ۔ اندر کے رُخ چار محرابیں دے کر ایک گولے کی چھت قائم کی ہے۔ عمارت کے باہر کے رُخ چھت مسطح ہے جو پتھر کی سلوں سے بنی ہے۔

عمارت کا طرزِ تعمیر معمولی ہے۔ عام طرز کی محراب کے پایوں پر نقش و نگار البتہ کندہ ہیں۔

"بھنگی دروازہ"

عالمگیر دروازے کے آگے بڑھ کر سیاح سنگ بست راستے سے ایک اور تنگ گھاٹی پر گزرے گا جو زیادہ گہری نہیں ہے وہاں دمامہ اور ایک دوسرا دروازہ دیکھے گا۔ اس کا نام بھنگی دروازہ ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ

لہ کتبہ:-

در زمانِ شاہِ عالم گیر خاقانِ جہاں — از سرِ نو گشت برپا ایں درِ گردوں کشاں

در ہزار ہفتاد و نہ آغاز و ہم انجام یافت — ز اہتمامِ خانِ عالیشان محمد بیگ خاں

در جلوسِ ایں شہنشاہِ جہاں اورنگ زیب — بود سالِ یازدہ از روے تحریرِ بیاں

یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ قلعے کی مکمل تیاری پر ایک بھنگی بھینٹ چڑھایا گیا۔ گانو والے آج بھی دیوار میں ایک پتھر دکھلاتے ہیں جو دروازے سے چند گز کے فاصلے پر ہے اور جس کے پیچھے دیوتاؤں کی خوشی کے لیے بھنگی کی بھینٹ چڑھائی گئی تھی۔

دروازہ ستون اور سر ذل پر مشتمل ہے اور غالباً ہندو عہد کا ہے عمارت کی چھت گر پڑی ہے۔ اس دروازے سے بہت سیدھی چڑھائی ہے اور کشادہ سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ ساٹھ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد سیاح "دہلی دروازے" میں داخل ہوگا جو قلعے کا خاص دروازہ ہے۔ سڑک بھنگی دروازے کے پاس سے چکر کھاتی ہوئی دو اور دروازوں سے گزرتی ہے جن کو گاڑی اور کھڑکی دروازہ کہتے ہیں۔

سیڑھیاں جو دہلی دروازے تک جاتی ہیں خوب چوڑی ہیں۔ ہر ایک سیڑھی طول میں ۱۰ فٹ اور عرض میں ۶ سے ۷ فٹ تک ہے۔ یہ سیڑھیاں شکستہ حالت میں ہیں اور بعض جگہ سے اکھڑ گئی ہیں۔

دہلی دروازہ

اس دروازے کو مختلف زمانوں میں محاصرین کی زبردستیاں سہنی پڑی ہیں لیکن وہ حصے جو ابھی قائم ہیں فنِ تعمیر کے پُرشوکت طرز کا پتا دیتے ہیں اور نقش ونگار کی خوبی اور حسنِ تکمیل کے شاہد ہیں۔ بیرونی محراب کا بالائی حصہ جو نہایت شاندار تھا گر گیا ہے۔ محض کھمبے ایستادہ ہیں۔ نیچے ایک محراب ہے جس کا تناسب نہایت عمدہ ہے۔ درمیانی فرق ۱۲ فٹ ۳ انچ ہے اور چبوترے سے ۲۸ فٹ بلند ہے۔ محراب سرخ رنگ کی پتھر کی بنی ہے اور اس کے

اوپر بندوق کے روزن نہایت خوب صورتی سے بنائے گئے ہیں ان روزنوں میں میناکاری کے اودے چوکے لگے ہیں اور سرخ رنگ کی عمارت میں ان کی گہری اُداہٹ بہت نظر فریب معلوم ہوتی ہے۔

راستہ جو دروازے سے جاتا ہے پٹا ہوا تھا لیکن چھت گر چکی ہے اور اب وہ ناموزوں پشتہ بندی جو کچھ مدت بعد کی گئی، راستے کے دونوں جانب نظر آتی ہے۔ اوپر تین محرابیں جدید ہیں لیکن اُن سے اصلی چھت کی سطح کا پتا چلتا ہے ان محرابوں کے سامنے داخلی دروازہ ہے جس کا نقشہ ویسا ہی ہے جیسا کہ بیرونی دروازے کا۔ پہلا راستہ اصل میں اس دروازے کے باہر تک گیا تھا اور نگہبانوں کے کمرے دونوں طرف بنے ہوئے تھے۔ چھت گو کہ گر گئی ہے لیکن محرابیں جن پر چھت قائم تھی اُن کے آثار باقی ہیں۔ ان سے احساسِ تناسب کی اس کمی کا اظہار نہیں ہوتا جو مذکورہ بالا محرابوں سے ہوتا ہے۔

دروازے کے اندر مغربی دیوار پر ہاتھیوں کی دو صورتیں ایک کنول کی کلی اور بیچ میں ایک چکرم نظر آتا ہے۔ یہ گچ سے زمانۂ حال میں تیار ہوئے ہیں کیونکہ یہ موجودہ ریاست دھار کے نشان ہیں۔ ان کے نیچے موروں کی دو تصویریں بنی ہوئی ہیں۔

دروازے سے باہر نکلنے کے بعد سیاح اپنے داہنے ہاتھ کی طرف (مغرب) مسجد کا ایک چھوٹا سا نیچا احاطہ دیکھے گا جس پر ایک کتبہ[1] نصب ہے۔

---

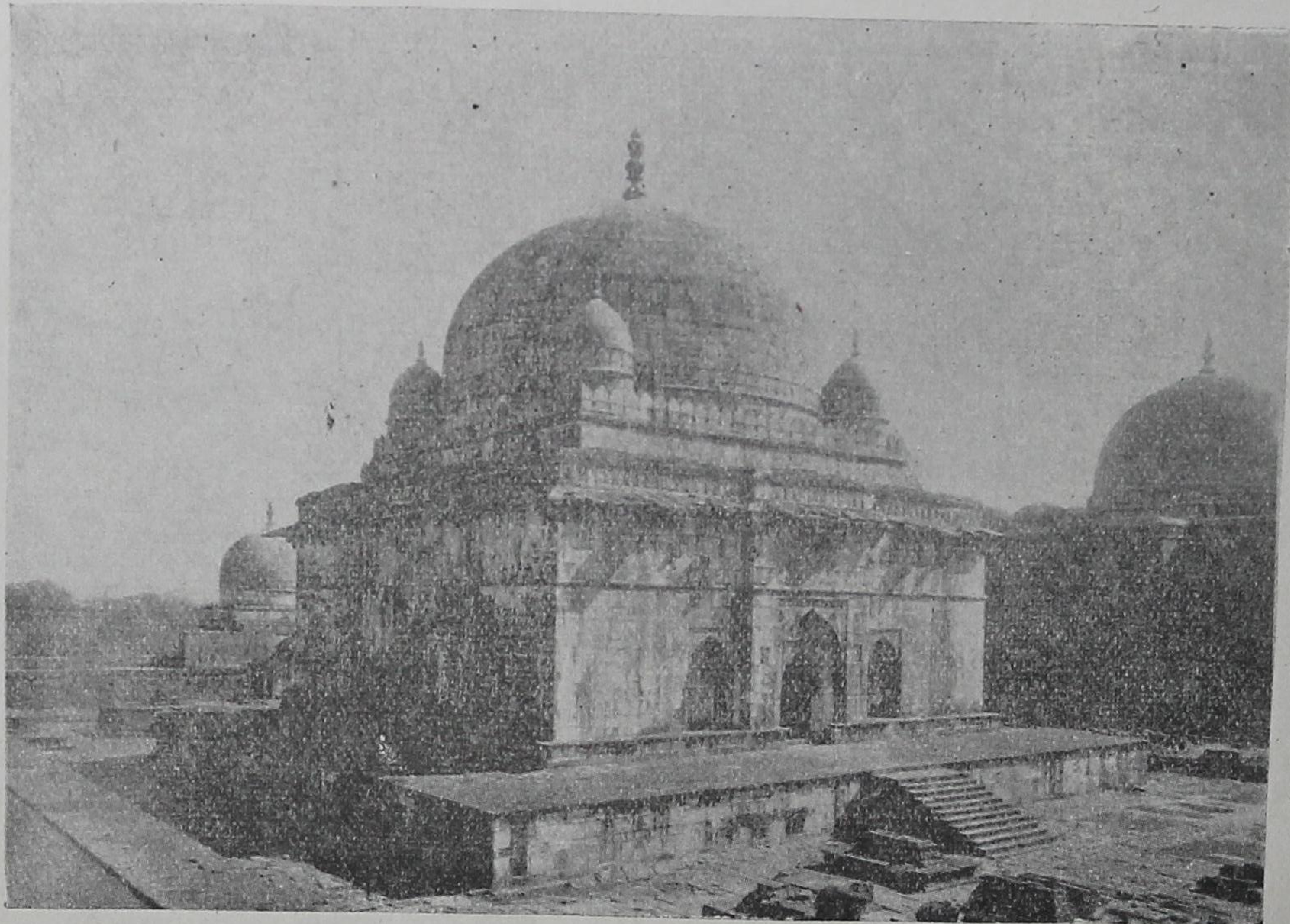
[1] اس کتبے میں خطابات حسام الدنیا والدین اور تاریخ ۲۰ ربیع الثانی ۸۲۰ھ درج ہیں جو ہوشنگ کے خطاب (عہدِ حکومت ۸۰۸ھ تا ۸۳۲ھ ۱۴۰۵ء تا ۱۴۳۲ء) کے مطابق ہیں۔ کتبے کی عبارت کے لیے ملاحظہ ہو ہندستانی اسلامی کتبات (۱۹۱۱-۱۲) ص ۱۰ لیکن وہاں تاریخ صحیح نہیں پڑھی گئی۔ ۸۲۰ھ ہونا چاہیے ۹۲۰ھ غلط ہے۔

یہ ایک معمولی سی عمارت ہی جو ہندو مندروں کے اینٹ چونے وغیرہ سے تعمیر ہوئی ہی اس میں ایک دہرا بڑا کمرہ ہی (۳۵ فٹ × ۱۵ فٹ ۶ انچ) اور ایک کھلا ہوا صحن (۲۶ فٹ ۶ انچ × ۱۷ فٹ ۸ انچ) کمرے کے در کڑیاں ڈال کر بنائے ہیں لیکن مغربی دیوار کے طاقوں پر محرابیں ہیں۔ درمیانی طاق کی ابھی حال ہی میں مرمت کی گئی ہی۔ اگرچہ یہ عمارت کسی خاص تعمیری خوبی کی مدعی نہیں ہی لیکن اس سبب سے قابلِ توجہ اور اس زمانے کی یادگار ہی جب مانڈو میں قلعے کی چہار دیواری اور دلاور خاں کی مسجد کے علاوہ صرف چند عمارتیں تھیں اور محافظ فوج نے وقتی ضرورت کی وجہ سے ایسی عمارتیں تعمیر کی تھیں۔

دہلی دروازے سے نکل کر سڑک کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ ایک شاخ شاہی احاطہ کو (جس کا بیان آگے آئے گا) جاتی ہی اور دوسری مانڈو گاؤں کو جہاں مسجدِ ہوشنگ اور اس کا مقبرہ واقع ہیں۔ مقبرہ تاریخی اعتبار سے کچھ قبل بنا اس کا ذکر پہلے ہوگا۔

"مقبرۂ ہوشنگ"

اس مقبرے کا بڑا دروازہ شمال میں ہی۔ آگے برساتی بنی ہی جس پر سنگِ مرمر کا نہایت خوشنما گنبد ہی۔ چھ چوڑی سیڑھیاں ہر ایک ۶ انچ بلند برساتی کے پختہ فرش تک جاتی ہیں۔ برساتی اندر سے ۱۸ فٹ ۶ انچ مربع ہی اس کے ہر ایک پہلو میں شمال، مشرق، مغرب کی طرف تین محراب دار در ہیں۔ درمیانی درول میں بہ نسبت پہلو کے دروں کے زیادہ فاصلہ دیا ہی۔ محرابوں کی وضع خوب صورت اور وہ اختلاف جو درمیانی فاصلے کے فرق سے پیدا ہوا ہی نہایت صنعت کارانہ ہی۔ برساتی کی داخلی مربع شکل اوپر کی جانب کونوں کی



مقبرہ ہوشنگ

محرابوں سے مثمن میں تبدیل ہو گئی ہی کچھ اور اوپر جا کر یہ سولہ پہلوں کی ڈاٹوں سے بدل گئی ہی جن پر گنبد کا دَور قائم ہی وہ ستون جن پر محراب کے ستونوں پر سادے چوکور شہتیر ڈالے ہیں برساتی کے اندر کچھ آرایش نہیں سوائے چند چھوٹی چھوٹی نقش دار محرابوں کے جن میں نیلے چوکے لگے ہیں۔ گنبد کے اندر سے رُخ صرف ڈھولے کے کنارے کنارے صندلے میں ابھری ہوئی منڈیر بنادی ہی اور اس کے نیچے تاروں کا ایک جھمکا بنا ہی گنبد کی کرسی کے کنارے پر نفیس بیل ہی جس میں پتیاں بہت صفائی سے ترتیب دی گئی ہیں۔

برساتی سے اندر کی جانب جاتے ہوئے پہلے ایک پختہ فرش پار کرنا ہوتا ہی جو دیوار سے ملا ہوا ۲۲۰ فٹ لمبا اور ۱۸ فٹ چوڑا ہی۔ اس پر سرخی بچھی ہوئی ہی۔ دو سیڑھیاں اترنے کے بعد مقبرے کے صحن میں داخل ہونا پڑتا ہی جس کا طول ۲۲۷ فٹ ۳ انچ اور عرض ۲۱۹ فٹ ۶ انچ ہی وہاں بھی ایک پختہ فرش ہی جو برساتی کے متصل فرش سے ملتا چلتا ہی۔ اس کا طول و عرض اتنا ہی ہی جتنا پہلے فرش کا۔

مقبرہ صحن کے وسط میں سنگِ مرمر کے ایک مربع چبوترے پر بنا ہی جو زمین سے ½۶ فٹ بلند ہی اور اوپر ہر ایک جانب سے تقریباً ۱۰۰ فٹ ہی چبوترے کے کنارے کنارے بیل بوٹے ترشے ہوئے ہیں جن میں سہاول نکلے ہوئے ہیں۔ یہ ان ہندو بت تراشوں کا کام معلوم ہوتا ہی جو مقبرے کی تعمیر میں شریک ہوں گے۔ چبوترے کا زینہ شمال کی جانب ہی تیرہ سیڑھیاں اس پختہ فرش تک ہیں جو مقبرے کے چاروں طرف ہی اور جس کا عرض ۱۱ فٹ ہی۔

مقبرے کی دیواریں چبوترے پر ۳۱ فٹ ۶ انچ بلند ہیں اور اُن کی

سطح کے اختلاف کی اوّل وجہ تو ستونوں کی قطار ہے ر ۲ فٹ ۶ انچ بلند) دوسرے زیادہ بلندی پر افقی دھاریاں اور ایک چھجا ہے جس میں ہاتھی دانت کی دیوار گیریاں لکڑی کے طرز کی لگی ہیں۔ اس چھجے کے اوپر چھوٹی چھوٹی آرائشی محرابیں ہیں جن پر ابھرے ہوئے نقش بنے ہیں۔

مقبرے کا داخلہ ایک محراب دار دروازے کے اندر سے ہے جس کا نفیس تناسب اور جس کی کندہ کاری یونانی نقش ونگار کی یاد دلاتی ہے اوپر اور پہلوں پر نیم شگفتہ کنول کے پھولوں کا ایک سلسلہ ہے اور محراب میں گلاب کے پھول ابھرے ہوئے ہیں۔ دروازے کے اوپر آرائشی منڈیر ہے اور اس کے نیچے نیلے میناکاری کے ستارے لگے ہیں۔ دروازے کے دونوں جانب ہندی طرز کی جالیاں ہیں جو اُن دیواروں میں بھی ملتی ہیں جو شمال، مشرق اور مغرب کی جانب ہیں۔ یہ بات نہایت دل چسپ ہے کہ ان جالیوں کا بھی وہی مقصد ہے یعنی عمارت کے اندر ہلکی ہلکی روشنی پہنچانا جو گاتھ قوم کے بڑے گرجوں میں رنگین شیشے کی کھڑکیاں کرتی ہیں۔ آخر الذکر میں رنگوں کا اجتماع گو ایک عبادت گاہ کی عظمت کے مطابق ہے لیکن کسی مقبرے کی سنجید خاموشی کے لیے موزوں نہ تھا۔

مقبرہ اندر سے مربع اور اس کا ہر پہلو ۴۹ فٹ ۲ انچ ہے[1]۔ یہ تیس ۳۰ فٹ بلند محرابوں سے مثمن کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا۔ محرابیں ہر ایک کونے پر ڈالی گئی ہیں تاکہ دیواروں پر سے گنبد کا وزن ہٹ جائے اور زیادہ بلندی پر یہ مثمن ان ڈاٹوں سے سولہ پہلو کر دیا گیا ہے جو اسی مقصد کے لیے تعمیر ہوئی تھیں۔ یہ طریقے ایک طرف تو فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے بیحد موثر ہیں اور دوسرے عمارت کی یکسانیت دور کرنے میں قابلِ ستایش خوش مذاقی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے

---

[1] دیواریں ۱۱ فٹ چوڑی ہیں۔

فنِ تعمیر کی ہمیشہ سے ایک دل کش خصوصیت ہے۔
ڈاٹوں کے اوپر گنبد کے حلقے کے چاروں طرف مختلف نقشے ہیں جن میں سے ایک میں آرائشی محرابیں اور ان کی پشت پر لاجوردی مینا کاری کی گئی ہے۔ معمار کا یہ ذوق بھی قابلِ غور ہے کہ زینت و آرائش کے لیے اس نے گہرے نیلے رنگ کے چوکے استعمال کیے ہیں۔ یہ رنگ آج تک بالکل تازہ ہے۔
ہوشنگ کا مزار ایک نیچے سنگِ مرمر کے فرش پر تعمیر کیا گیا ہے جس کا طول ۱۸ فٹ ۴ انچ اور عرض ۱۴½ فٹ ۶ انچ ہے۔ فرش پر خانے بنے ہیں جن میں سیاہ اور زرد مربع پتھر استعمال کیے گئے ہیں۔ سنگین تابوت ڈبے کی شکل میں تراشا گیا ہے جس میں پیچھے ہٹے ہوئے بند ہیں۔ سرے پر محراب بنی ہے اس کے ستون ہندو طرز کے ہیں۔ گنبد کے نیچے بہت سی دوسری قبریں ہیں جن میں سے تین کے تابوت سنگِ مرمر کے ہیں۔ ایک سرخ پتھر کی ہے اور باقی پر چونے کا صندلا ہے۔ مقبرہ اندر سے پاک صاف ہے۔ محرابوں کی کشش اور گنبد کے گھیر سے اُسی بلند خیالی و وسعتِ نظر کا پتا چلتا ہے جیسی کہ ہم گاتھی گرجوں میں دیکھتے ہیں۔
یاد رہے کہ مانڈو کے فنِ تعمیر نے عہدِ شاہجہاں میں بجا طور پر شہرت حاصل کی اور اس کتبے میں جو مقبرے کے دروازے کے داہنے بازو پر کندہ ہے درج ہے کہ "دربارِ شاہجہاں کے چار معمار اس مقام کے ماہرینِ[1] فنِ تعمیر کی

[1] کتبے کا ترجمہ یہ ہے "۹ ربیع الثانی ۱۰۷۰ھ ۱۴ دسمبر ۱۶۵۹ء میں بندہ ناچیز لطف اللہ ابنِ استاد احمد معمارِ شاہجہانی، خواجہ جادو رائے، استاد شیورام اور استاد حامد اظہارِ تعظیم کے لیے حاضر ہوئے اور یہ چند الفاظ بطورِ یادداشت قلمبند کیے"۔ دہلی میں جامع مسجد کے قریب استاد حامد کے نام پر ایک محلہ ہے کتبے کی عبارت کے لیے (باقی ملاحظہ صفحہ ۵۲ پر)

تعظیم کے لیے ۱۶۵۹ء میں مانڈو آئے ان میں سے ایک استاد حامد تھا جس کو تعمیرِ تاج محل سے خاص تعلق ہے۔

گنبد باہر سے کچھ چپٹا اور بھاری نظر آتا ہے اور دہلی کی تغلق عمارتوں کے گنبدوں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے چار گنبد جو کونوں پر ہیں گو بہت موزوں نظر نہ آئیں لیکن ان کی مخروطی شکلیں ایرانی سپاہیوں کے قدیم آہنی خودوں سے مشابہ ہیں۔ اس شاندار مرکزی گنبد کے گرد ان کی موجودگی مطلب سے خالی نہیں۔ مرکزی گنبد کے گرد اس قسم کے برج زیادہ ترقی یافتہ صورت میں بعد کی ہندستانی اسلامی عمارتوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً دہلی میں لودھیوں کے مقبرے یا سہسرام میں مقبرہ شیر شاہ میں یہ برج فنِ عمارت کا ایک دل کش عنصر ہیں۔

گنبد کی چوٹی میں ایک نوک نکلی ہوئی ہے جس کا پایہ قعب نما ہے اور جس پر ایک اگردان کی شکل کی چیز قائم ہے۔ اس پر دو برتن اوپر تلے رکھے ہیں اور سب کے اوپر ایک کرہ و ہلال ہے۔ یہ عمارت کو دیکھتے ہوئے بہت چھوٹا نظر آتا ہے۔ دکن میں[1] مختلف عمارتوں کی چوٹیوں پر ہلال لگے ہوئے ہیں لیکن یہ زیادہ تر شام و ایران میں پائے جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مانڈو میں یہ نشان ان ممالک سے براہ راست نقل کیا گیا ہے۔

صحن کے مغربی بازو میں ایک دالان ہے جس کو دھرم سالہ کہتے ہیں اس کے فنِ تعمیر میں دل کشی ہے۔ اس کا طول ۲۷ فٹ ۳ انچ ہے یہ ستونوں کی

(بقیہ صفحہ ۵۱) ملاحظہ ہو ہندستانی اسلامی کتبات ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء، ص ۲۳

[1] یوں سمجھیے کہ دولت آباد کا چاند مینار اور علی برید کا مقبرہ جو بیدر میں ہے لیکن یہ عمارتیں مقبرہ ہوشنگ کے بعد کی ہیں۔

قطاروں سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہی۔ ستون[1] ہندوانی طرز کے ہیں۔ چھت مسطح ہی اور ان مرغولوں سے کئی درجے میں تقسیم ہی جو ستونوں پر قائم ہیں چھت کی ترتیب کا ہندوانی طرز نہایت نمایاں ہی اور ایسا ہی طرز ان دیوارگیریوں کا ہی جن پر عمارت کے سامنے کے چھجے قائم ہیں۔ اس دالان کے ہر ایک سرے پر ایک مستطیل بڑا کمرہ ہی جس کا طول ۲۵ فٹ ۶ انچ اور عرض ۱۷ فٹ ۱۰ انچ ہی۔ ان کمروں کی چھتیں ہر طرف سے اوپر کی جانب جھکی ہوئی ہیں جس سے ایک چار پہلو گنبد بن گیا ہی۔

دالان کی پشت پر ایک لمبا تنگ کمرہ ہی جو طول میں ۲۲۷ فٹ ۲ انچ اور ۱۴ فٹ چوڑا ہی۔ اس کی چھت لداؤ کی اور پشت کی دیوار ۶ فٹ ۹ انچ چوڑی اور سامنے کی صرف ۳ فٹ ۱۰ انچ ہی دونوں سروں پر ۱۴×۱۴ فٹ چوکور کمرے ہیں۔

اس پشت کے بڑے کمرے کی تعمیر عالیشان اور مقبرے کے عام طرز کے مطابق ہی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہی کہ دالان جو اس کے سامنے ہی بعد میں اس وقت شامل کیا گیا جب کہ ہندو معماروں کا دخل ہو گیا تھا۔ مقبرۂ ہوشنگ بہت جلد زیارت گاہ بن گیا اور یہاں عرس منعقد ہونے لگا جو گزشتہ نصف صدی قبل تک جاری تھا کیونکہ "مالکم" اور "بومے سب الٹرن" دونوں نے اپنی تحریرول میں اس کا ذکر کیا ہی۔ عرس کے دن غربا کی بڑی تعداد کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔

---

[1] ہر ایک ستون کی کرسی ۱ فٹ ۲ انچ بلند اور ۱ فٹ ۷ انچ مربع ہی بلیاں ۸ فٹ ۳ انچ بلند ہیں؛ نیچے کا حصہ تین حصوں میں تقسیم ہی اور پورے پتھر کا بنا ہوا ہی۔ یہ ۷ فٹ بلند ہی اوپر کا حصہ ایک گول پتھر پر مشتمل ہی جو ا فٹ ۳ انچ اونچا ہی اور سر ستون مربع ہیں۔

چونکہ بڑے کمرے میں اتنی گنجایش نہ تھی اس لیے معلوم ہوتا ہی کہ سامنے کے دالان کا اضافہ کیا گیا۔ یہ یاد رہے کہ مالوے میں مسلمانوں کے ابتدائی عہدِ حکومت میں مسلمان معماروں کی تعداد بہ مقابلہ مقامی معماروں کے کم ہوگی اور صرف شاہی عمارتوں کا کام مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے کام مثلاً عماراتِ عامہ کی تعمیر یا اُن میں اضافہ ہندو معماروں کو تفویض ہوا ہوگا۔ ظاہرا یہی وجہ ہی کہ دکن اور مانڈو میں بھی مسجدوں اور دیگر عمارتوں کا طرزِ تعمیر ہندوانہ ہی حالانکہ اسی زمانے میں بلکہ اس سے قبل کی عمارتیں اسلامی طرز میں تعمیر ہونے لگی تھیں۔ مذکورہ بالا خیالات کی بنا پر دھرم سالے کی تاریخِ تعمیر پندرھویں صدی کے ربع آخر میں سولھویں صدی کے نصف تک کسی زمانے میں متعین کی جاسکتی ہی۔

مقبرہ ہوشنگ کا خارجی رُخ کچھ چھپ جاتا ہی کیونکہ یہ جامع مسجد[1] کی پشت پر بنا ہی۔

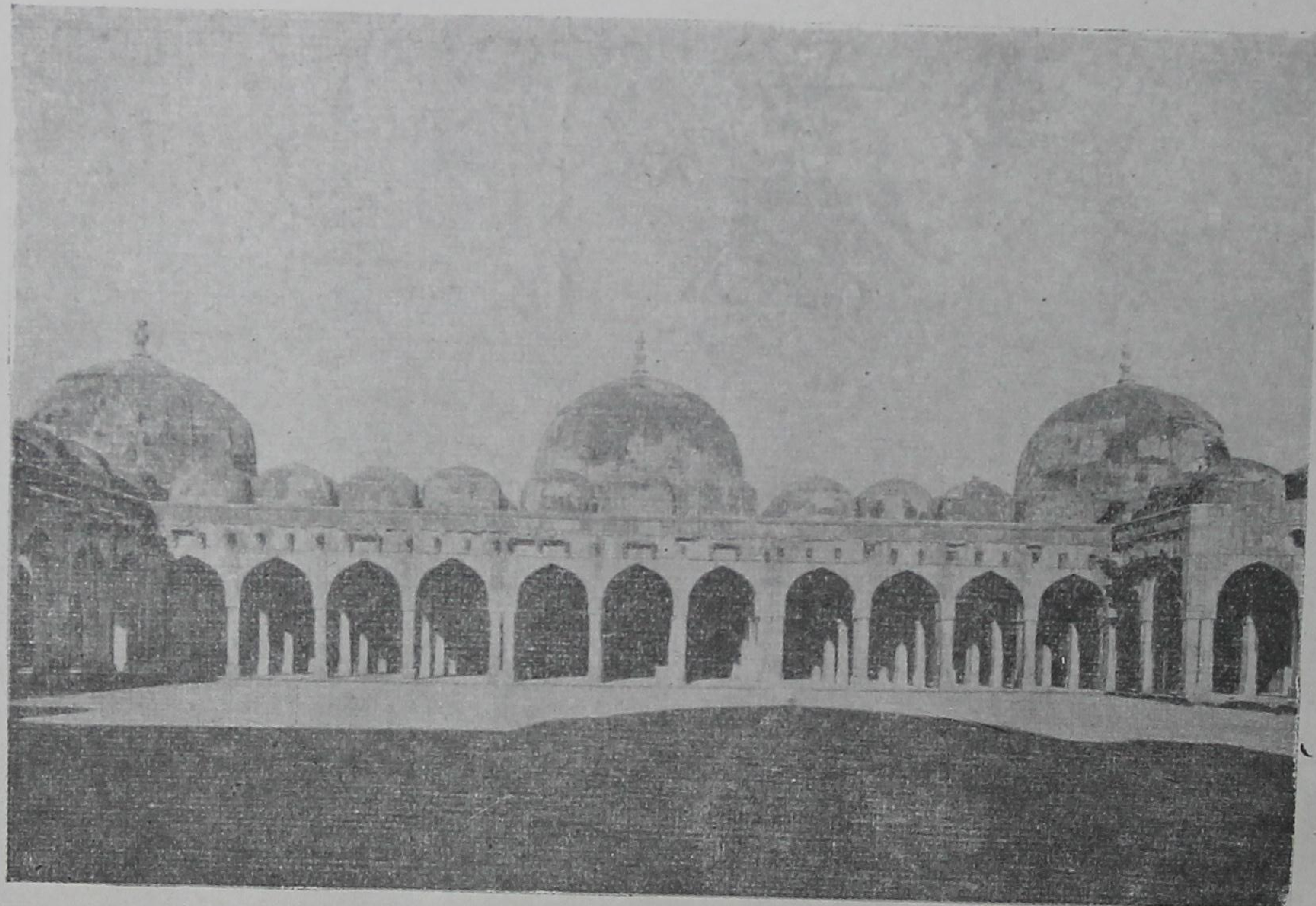
"جامع مسجد"

اس کتبے کے مطابق جو دروازۂ جامع مسجد پر کندہ ہی اس کی تعمیر ہوشنگ نے شروع کی اور محمود خلجی نے ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں اس کو

[1] اس کے احاطے کی دیوار پر سرخ مسالہ لگا ہی یہ مشرق سے مغرب تک ۳ ، ۲ فٹ و انچ لمبی ہی اور شمال سے جنوب تک ۴ ، ۲ فٹ ۶ انچ ہی۔

[2] کتبے کی لوح کے بائیں جانب جو عبارت ہی اس کا ترجمہ یہ ہی:-

"(۱) اس حرمِ پاک کا ہر ایک ستون خانۂ کعبہ کی نقل ہی ...... (۲) اس مسجد کی تعظیم و تکریم کے لیے فرشتے اس کے چاروں طرف کبوترانِ حرم کی طرح منڈلاتے ہیں (باقی ملاحظہ ہو صفحہ ۵۵ پر)



جامع مسجد

مکمل کیا۔ لوحِ کتبہ کا نصف حصہ داہنی جانب غائب ہے لیکن ایک تصنیف جس کا نام ہے "تزک افغانی" ارمغانِ شاہجہانی (آگرہ، طباعت ۲۹۳؁ء) میں کتبے کے ۱۱ شعروں میں سے ۹ شعر درج ہیں اگر یہ اسی کتبے کے اشعار ہیں اور خود مصنفِ تزک کا نتیجۂ فکر نہیں تو اس کا یہ آٹھواں شعر جس کا مفہوم ہے کہ "میں نے اس کو جامع دمشق کے طرز پر بنایا" قابلِ غور ہے۔[1] مانڈو کی مسجد کا نقشہ جامع دمشق سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا گو ایک بات میں یہ دونوں مسجدیں ملتی جلتی ہیں وہ یہ ہے کہ مسجد جامع کے گنبدوں کی شکل فلسطین و شام کے مصنوعی چوبی گنبدوں سے بہت مشابہ ہے اور اس مسجد کے گنبد کی ہموار ڈاٹیں اس مشابہت کو زیادہ مکمل کر دیتی ہیں۔ عمارت کا عام نقشہ جامع قیرواں کے نقشے سے مشابہ ہے لیکن محرابوں کی شکل مختلف ہے اور مانڈو کی مسجد میں کوئی مینار نہیں ہے۔ دونوں عمارتوں کا عام فن کارانہ اثر یکساں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معمار مشترک نصب العین پیشِ نظر رکھتے تھے۔

ایک برساتی جو تقریباً ۵۵ فٹ مشرقی جانب ہے مسجد کا بڑا راستہ ہے

(بقیہ صفحہ ۵۴) اور اڑتے ہیں۔ . . . . (۵) چرخِ ستم گر کی گردشوں سے جب اس کا (ہوشنگ کا) آفتابِ عمر لبِ بام ہوا . . . . (۷) نگہبانیٔ سلطنت، تکمیلِ عمارات اور بربادیٔ اعدا میری آخری نصیحت ہے جس پر خلوص و سعیٔ بلیغ سے عمل کیا جائے . . . . (۹) سلطان علاءالدین مجسمہ رحمت الٰہی، مظہرِ نورِ ایماں اور آئینہ تمنائے مردم . . . . (۱۱) ہوشنگ کی وصیت کے مطابق علاءالدین نے عمارت کی تکمیل ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں کی"۔ کتبے کے متعلق اور زیادہ معلومات ہندستان کی اسلامی کتبات سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۲۲ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۰ء

[1] تزک افغانی ص ۱۰۶-۱۰۵

عمارت کا بیرونی حصہ اس طرف کچھ بدنما ہی اور ان کوٹھڑیوں کے محراب وارد جو سیاحوں اور مسجد کے عملے کے لیے بنائی گئی تھیں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے قلعے کی کریہ منظر دیواروں میں جنگلے لگے ہوں۔ نمایاں خصوصیات میں چند نقش اور دو آرائشی محرابوں کے حاشیے ہیں جن میں ایک بیچ پر ہی اور دوسرا بالکل اوپر اوپر والے میں رنگین چوکے لگے ہیں جس سے عمارت کے روکھے پن میں بہت کچھ کمی ہو جاتی ہی۔

برساتی کے دونوں طرف جو کوٹھڑیاں ہیں ان کے سامنے ایک چھ فٹ بلند برآمدہ ہی جس میں بارہ در تو برساتی کی سیڑھیوں کے بائیں جانب ہیں اور تیرہ داہنی جانب ہر ایک کوٹھری کا طول و عرض ۸ فٹ اور ۶ فٹ ۶ انچ ہی۔

برساتی کے دروازے تک پہنچنے کے لیے تقریباً تیرہ سیڑھیاں طے کرنی پڑتی ہیں۔ برساتی سطحِ زمین سے ۱۵ فٹ بلند ہی۔ اندر پہنچنے کے لیے راستہ ایک دروازہ میں سے ہی جس میں سنگِ مرمر کے بازو اور سردل لگے ہیں ان کے حاشیے نہایت خوب صورت نقش و نگار سے آراستہ ہیں۔ دروازے کے اوپر ایک محراب دار جھروکہ نہایت مناسب بنا ہی۔ محرابوں میں گلاب کے خوب صورت نقش ہیں اور ہلکے بیل بوٹوں سے خوش مذاقی کا اظہار ہوتا ہی جھروکے کی محراب کے پہلوؤں پر خالی ستاروں کے کنارے بنے ہیں اور نیلے چوکے دروازے کی سجاوٹ کے لیے اکثر جگہ لگے ہیں دروازے سے داخل ہونے کے بعد سیاح دالان میں پہنچتا ہی جو ۲۴ فٹ ۸ انچ مربع ہی اور جس پر گنبد ہی[1] اس میں روشنی کے لیے خوب صورت جالیاں دی ہیں

[1] مشرقی دیوار ۹ فٹ دبیز ہی اور دوسرے اطراف میں اس کی دبازت ۶ فٹ ہی

اور عمارت کا اندرونی حصہ اُن مینا کاری کے نیلے چوکوں سے آراستہ ہے جو ستاروں اور تراشیدہ جواہرات کے طور پر لگے ہیں۔ برساتی کے مغربی جانب جو در ہے وہ صحن کا راستہ ہے اور اس میں کڑیاں استعمال کی گئی ہیں۔ اس کے اوپر ایک محراب بیل بوٹوں سے آراستہ ہے۔

برساتی کے مغربی دروازے سے گزرتے ہوئے سیّاح اپنے سامنے محرابوں اور گنبدوں کا ایک دل کش نظارہ دیکھے گا۔ فنِ تعمیر کی امتیازی خصوصیات سادہ حسن و شوکت ہیں صحن تقریباً ۱۶۲ فٹ مربع ہے اور اس کے چاروں طرف دالان ہیں۔ وہ دالان جو شمال اور جنوب کی جانب ہیں تین درجے نیچے[1] ہیں، وہ جو مشرق کی جانب ہے محض دو درجے نیچا[2] ہے اور مغرب کی طرف کا پانچ درجے۔ محرابوں اور ستونوں کا طرز نہایت ہی خوش نما ہے اور ان کی ترتیب بڑے سلیقے سے کی ہے۔ صحن کی بیرونی محرابوں کا سلسلہ دوہرا ہے اور کچھ ایک دوسرے سے الگ الگ ہے۔ مغربی دالان (نماز کا بڑا کمرہ) کی محرابوں کا تیسرا سلسلہ دوہرا ہے اور اسی طرح اس دالان کی تیسری، ساتویں، دسویں اور چودھویں قطاریں مشرق سے مغرب کی جانب ہیں۔ اس ترتیب کے اختیار کرنے کا مقصد یہ تھا کہ عمارت کے چاروں دالانوں کی قبہ نما چھتوں کو مستحکم کیا جائے اور مغربی دالان کے تینوں بڑے گنبدوں کو کافی سہارا مل جائے۔ اس طرز سے دالان میں محرابوں کی دوہری قطاریں ہیں جو گنبدوں کی کرسی کو چاروں طرف سے سنبھالے ہیں، ان کونوں میں جہاں ان محرابوں کی دوہری قطاریں ملتی ہیں چار چار ستونوں کے مجموعے دیکھنے میں نہایت خوب صورت نظر آتے ہیں۔ گاتھی عمارتوں میں ایسا ہی

---

[1] ان میں ہر ایک ۴۰ فٹ ۶ انچ نیچا ہے۔

[2] یہ دالان ۳۲ فٹ ۷ انچ نیچا ہے

ایک عربی طغری جو آیات قرآنی پر مشتمل ہے نہایت دل کش ہے۔ ان طاقوں پر روزن
ہیں اور پاکھے سیاہ پتھر کے بنے ہیں جن پر ہندو طرز کی کندہ کاری ہے۔ بعد الذکر
طرز کے آثار زیادہ تر منبر سے ظاہر ہیں۔ اس کے جنگلے اور دیوار گیریوں پر
نویں اور دسویں صدی کے اکثر ہندو مندروں کے جنگلے اور دیوار گیریوں کا
شبہہ ہوتا ہے منبر میں گیارہ زینے ہیں اور اوپر ایک چھتر ہے جس میں چار محرابیں
ہیں اور ایک سنگِ مرمر کا خوش نما گنبد ہے۔ اس کا طرز نہایت پُر تکلف ہے
لیکن اس کا اچھا خاصا مقابلہ شمالی افریقہ کے کندہ چوبی منبروں سے یا سنگِ مرمر
کی چوپڑ کے مصری منبروں سے ہو سکتا ہے۔

مسجد کی سادگی اور عظمت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے منبر و در کی حد سے زیادہ
کندہ کاری کچھ بے جوڑ سی نظر آتی ہے لیکن جیسا کہ پیشتر کہا جا چکا ہے یہ ہندو معماروں
کا کام ہے جن کو آرائش سے عشق رہا ہے۔ فنِ تعمیر کی خوبیوں پر تزئین و زیبائش
کو برتری دینا ہندو عمارتوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

اس منبر کے روبرو ایک چھوٹا سا چبوترہ ہے جو ۱۰ فٹ ۳ انچ مربع اور
۲ فٹ ، انچ بلند ہے۔ یہ کچھ ناموزوں سا نظر آتا ہے۔ ظاہرا یہ ایک مکبر ہے جہاں
نماز کے وقت تکبیر کہی جاتی تھی۔

صحن کی جانب واپس آنے پر سیاح غور کرے گا کہ ان دالانوں میں
جو صحن کی جانب ہیں ہر ایک میں ۱۱ محراب وار در ہیں جو نہایت عظیم الشان
ہیں۔ ان کے اوپر دیوار گیریوں کی قطاریں ہیں جو چھجوں کو سنبھالے ہیں اور
زیادہ بلندی پر چھوٹی چھوٹی محرابیں ایک کے اوپر ایک ہی ہیں۔ ان محرابوں کے
کے اوپر ایک جنگلہ دیوار کے اوپر نصب ہے وہ جنگلہ بالکل شکستہ ہو چکا ہے جس سے چھت
کے اوپر کی نظر آتی ہیں ۔ : اس طرح سامنے کے رخ کے عمدہ تناسب

اثر دیو پیکر ستونوں کے پہلوؤں پر نقش و نگار تراش کر پیدا کیا گیا تھا۔

مغربی دالان طول میں ۲۶۸ فٹ ۶ انچ ہی اور ۸۲ فٹ نیچا ہی۔ یہ ستونوں کی اُن قطاروں سے تقسیم کیا گیا ہی جو مشرق سے مغرب کی جانب اور شمال سے جنوب کی طرف ہیں۔ ستونوں پر کوئی آرایشی کام نہیں۔ ان کی کرسی ۲ فٹ ۵ انچ مربع اور ۲ فٹ بلند ہی اور ایک ستون ۱۰ فٹ لمبا ہی۔ دالان کی چھت ۱۵۸ چھوٹے گنبدوں پر مشتمل ہی جن کے زاویے ستونوں پر قائم ہیں۔ ان چھوٹے گنبدوں کے علاوہ پہلو میں جیسا کہ بیان ہوا تین بڑے گنبد ہیں جن کے داخلی عظیم الشان وسیع حصّے چھت کی عظمت و حُسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

مغربی دالان کے ہر سرے پر بڑے گنبدوں کے نیچے ایک بالائی درجہ ہی جو نو پست ستونوں پر قائم ہی ہر ایک کی کرسی ۲ فٹ ۶ انچ مربع اور ۲ فٹ بلند ہی۔ ستون ۲ فٹ ۱۰ انچ ہی۔ ستونوں کے اوپر سے محرابیں آڑی نکلی ہوئی ہیں اور محراب دار چھت پر جو زمین سے ۱۲ فٹ بلند ہی ایک دوسرے کے درمیان سے گزرتی ہیں۔ چھت نہایت مضبوط و مستحکم ہی ان درجوں میں سے ایک درجہ معلوم ہوتا ہی کہ خواتین کے لیے تھا اور دوسرا شاہی مہمانوں کے لیے[1]۔

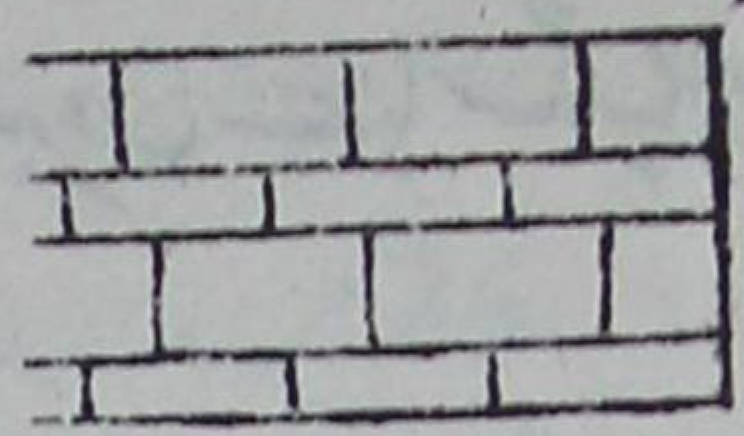
دالان میں کوئی آرایش نہیں ہی سوائے اس مغربی دیوار کے جو قبلے کی جانب ہی اور جس میں ۱۷ خوب صورت طاق بنے ہیں۔ ان میں سے بیچ کا نسبتاً بڑا ہی اور اس کے پہلوؤں پر عمدہ نقش و نگار کندہ ہیں۔ ان میں

---

[1] ایسے احاطے قرطبہ، قیروان اور شمالی افریقہ کے اکثر مقامات کی مسجدوں کی عام خصوصیت ہیں ان کو مقصورہ کہتے ہیں۔

وہم آہنگی کی خوبی جاتی رہتی ہے۔

مسجد کے شمالی جانب دو دروازے تھے۔ ایک تو صحن کی طرف اور دوسرا مقصورہ کے پاس عبادت گاہ کے داہنی جانب اسی کی پشت پر ایک برساتی ۲۴ فٹ مربع تھی جس کے تین طرف محراب دار در اور اوپر ایک ۱۵ فٹ بلند گنبد جو دیواروں سے بھی بلند تر تھا۔ یہ غالباً بادشاہ کے آنے کا راستہ تھا۔



ماہرِ فنِ تعمیر کی ایک دل چسپی کا باعث بیرونی دیوار کا وہ نقشہ ہے جس میں پتھر یکے بادیگرے کھڑے اور پڑے لگائے گئے ہیں۔

"ترپولیا دروازہ"

جامع مسجد کے مشرقی رخ کے سامنے ، سڑک کے کنارے ایک بلند دروازے[1] کے کھنڈر نظر آتے ہیں جس کے اصل میں تین در تھے۔ اس کا مسجد کے اتنا نزدیک ہونا کہ وہ مسجد کے ایک حصے پر چھا جائے کچھ بے ڈھنگا معلوم ہوتا ہے ممکن ہے کہ یہ دروازہ بعد میں کسی اور بادشاہ نے شاہی جلوس یا امرا کی سواری کے لیے تعمیر کرایا ہو۔

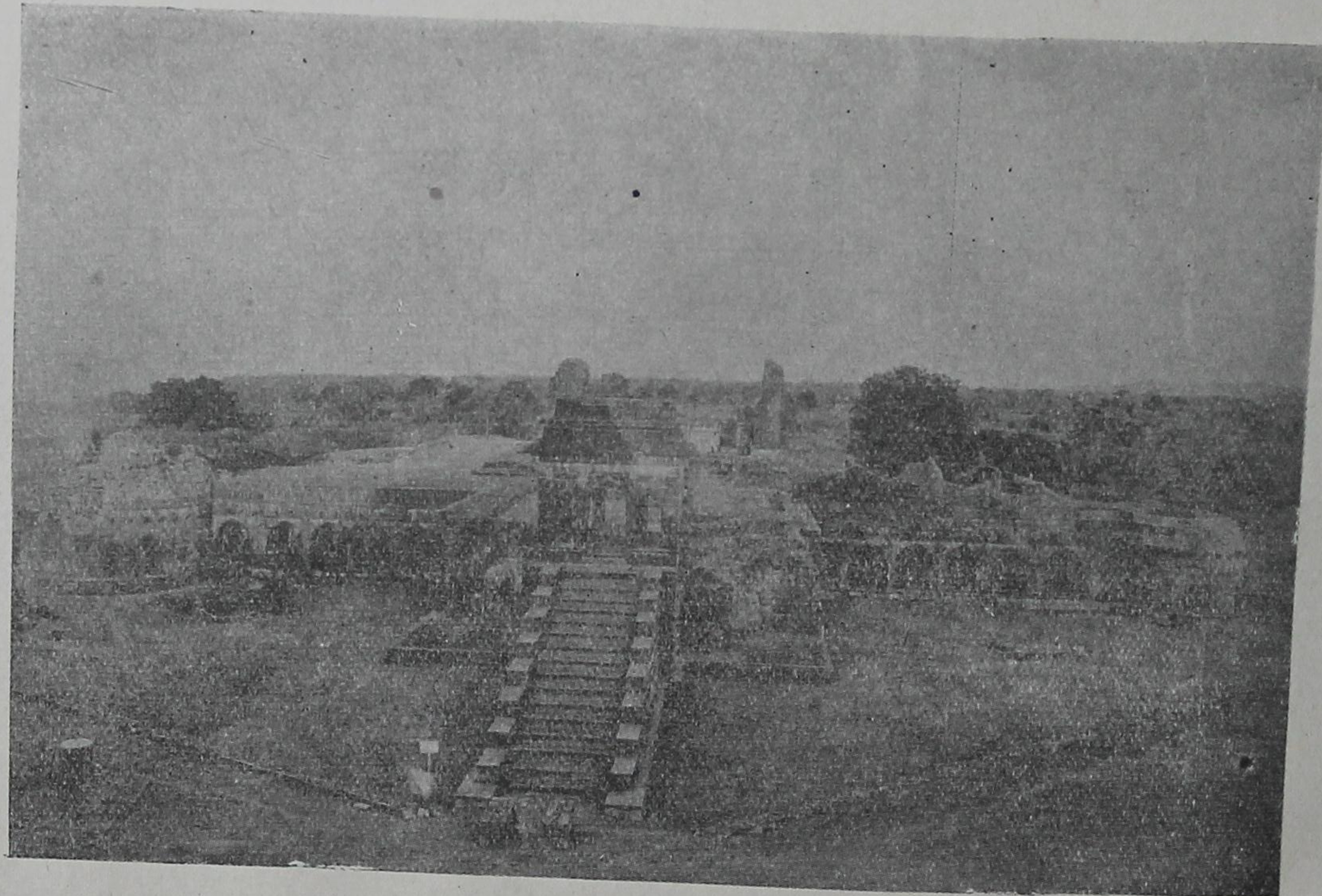
دروازہ اینٹ چونے وغیرہ سے بنا ہوا ہے۔

"مدرسہ یا اشرفی محل"

جامع مسجد کے صدر دروازے کے سامنے سڑک کی دوسری جانب

---

[1] راجپوتانہ اور شمالی ہند میں پول دروازے کے لیے عام لفظ ہے۔ ماہرینِ فن آگرہ اور دہلی کے ہیتھیا پول اور جے پور اور دہلی کے ترپولیا دروازوں سے بخوبی واقف ہیں۔



اشرفی محل

بہت سی عمارتیں چلی گئی ہیں جن کو مدرسہ یا اشرفی محل[1] کہتے ہیں۔ ظاہر ہی کہ یہ مدرسہ جامع مسجد سے ملحق ہوشنگ کے عہد میں تعمیر ہوا لیکن بعد میں چوک اور سامنے کا حصّہ مقبرۂ محمود خلجی کے تہ خانے کے لیے بند کر دیا گیا اور اس کے کونے کا بُرج اسی بادشاہ کی فتح یابی کی یادگار مینار میں شامل کر لیا گیا۔

عمارت جیسی آج نظر آتی ہی چوک کے ایک پہلو پر مشتمل ہی۔ اس میں دوہرے چھتے ہیں۔ خارجی چھتا کچھ تنگ ہی (۸ فٹ ۳ انچ) بہ نسبت داخلی کے (۱۱ فٹ ۹ انچ)۔ چھتوں کی پشت پر طلبا کی اقامت کے لیے ۱۹ کوٹھریاں ہیں جن میں زیادہ تر ۹ فٹ مربع ہیں لیکن چند کچھ بڑی ہیں۔ اس پہلو کی کل لمبائی ۲۱۰ فٹ ہی۔ وہاں شمال، جنوب اور مشرق کی جانب اسی قسم کے پہلو وسیع صحن کا احاطہ کیے ہوئے ہی۔ شمال و جنوبی پہلوؤں کے آثار کا پتا ان دو کوٹھریوں سے چلتا ہی جو ان سمتوں میں موجود ہیں۔

مدرسے کے چوک کا ایک حصّہ مغرب کی جانب نکلا ہوا ہی جس کا عرض و طول ۵۲ فٹ مربع ہی اور اس کے تین جانب چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں ہیں (۵ فٹ ۶ انچ × ۷ فٹ ۶ انچ) کوٹھریوں کے سامنے خوب صورت برآمدے (عرض ۵ فٹ ۲ انچ) ہیں اور شمال و جنوب میں ان برآمدوں کو پتلی اور نازک محرابوں نے کوٹھریوں کے سامنے تقسیم کر دیا ہی۔ محرابوں کے درمیانی فاصلوں کے مختلف فرق جو ہوشنگ کے مقبرے میں نظر آتے ہیں یہاں

---

[1] اشرفی محل کے نام سے مراد یہ ہی کہ "عمارت خوب صورتی میں اشرفی کی طرح ہی"۔ ایسا معلوم ہوتا ہی کہ یہ نام اس زمانے میں رکھا گیا ہی جب کہ عوام اس کا اصلی نام بھول چکے تھے۔ مانڈو میں بہت سی قدیم عمارتوں کا نام اسی طرح رکھا گیا مثلاً چھپن محل اس سبب سے نام ہوا کہ اس کی مرمت سمت ۵۶ھ میں ہوئی۔

بہت زیادہ نمایاں ہیں اور حُسنِ عمارت میں اضافہ کرتے ہیں۔ برآمدوں کی محراب دار چھتیں کٹی کمی پہلوؤں میں منقسم ہیں۔ جامع مسجد کی طرح پورا مدرسہ سرخ پتھر کا بنا ہوا ہے اور فنِ تعمیر کے ایک ایسے طرز کا اظہار کرتا ہے جس میں مسالے کی پاکیزگی اور اسلوب کی نزاکت نمایاں ہیں۔

یہ نکلا ہوا عمارت کا حصہ مغرب کی جانب ۳۰ فٹ ۸ انچ کے فاصلے تک گیا ہے اور ایک چبوترے سے اس حصے کا پتا چلتا ہے جو عمارت کے سامنے کا رخ تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے مقبرے کی تعمیر کے وقت گرادیا گیا۔

مدرسے کے بڑے چوک کے ہر ایک کونے میں ایک گول مینار تھا ان کے کھنڈر آج بھی عمارت کے جنوب مغرب، شمال مغرب اور جنوب مشرق کے گوشوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

"مینارِ فتح"

مدرسے کے شمال مشرق کا مینار بعد ازاں ایک بلند ستون کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا جس کو محمود خلجی نے اس فتح کی یادگار میں تعمیر کیا تھا جو اس نے راجا کمبھ والیٔ میواڑ پر حاصل کی تھی۔ ستون کی کرسی کا گھیرا ۱۵۰ فٹ ہے اور یہ سات منزل بلند تھا جس کا حوالہ جہانگیر[1] نے تزک میں دیا ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ یہ مینار کب گر گیا۔ لیکن اب اس کا محض ایک حصہ باقی ہے جو سطحِ زمین سے ۳۲ فٹ بلند ہے۔

"محمود خلجی کا مقبرہ"

یہ مقبرہ جب اچھی حالت میں ہوگا تو مانڈو کی نہایت شاندار عمارت

---

[1] روجرس اور بیورج۔ جلد ۲ ص ۳۸۱ فتح ایک مینار کے ابواب ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲ پر)

ہوگا کیونکہ پورا مقبرہ سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور ملحقہ زمین سے تقریباً ۲۴ فٹ بلند ہے، ۱۷ چوڑی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد برساتی ملتی ہے جس کے سامنے کے سفید رخ پر سیاہ و زرد پتھروں کے جوڑ لگے ہیں۔ برساتی کے ہر جانب تین محراب دار در ہیں جن کا حسنِ تناسب قابلِ داد ہے۔ بیچ کے در تنوّع کے لحاظ سے بہ نسبت کنارے کے دروں کے زیادہ وسیع ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ مقبرہ نہایت جلدی میں تعمیر ہوا ہے اور اسی وجہ سے پوری توجہ اس کی بنیاد کی جانب نہیں کی گئی جیسا کہ فرش کی بے ترتیبی سے ظاہر ہے۔ یہ بنیاد اپنی بھاری دیواروں اور شاندار گنبدوں کے وزن سے دب گئی اور عمارت کو تباہ کر دیا۔ اکبر کے عہد میں یہ عمارت خطرناک حالت میں تھی۔ اس کے نائب "عماد الدین حسین" نے عمارت کی مرمت میں اس بدمذاقی سے کام لیا کہ سنگِ مرمر میں سرخ رنگ کے بدنما پیوند لگائے اور پھر سرخ روئی حاصل کرنے کے لیے ایک کتبہ نصب کیا جس میں اپنے کام کو فراموش کر کے یہ اعلان کیا کہ خود اس نے عمارت تعمیر کرائی ہے۔[1]

عمارت کے منہدم ہونے کے بعد ملبے کا بڑا ٹیلا بن گیا جس نے محمود کی قبر کے سنگین تابوت کو اپنے نیچے چھپا لیا اور ابھی حال میں سر جان مارشل کے احکام کے بموجب جب قبر نہایت احتیاط سے کھود کر نکالی گئی تو وہ

(بقیہ صفحہ ۶۲) متعلق لکھتا ہے کہ ۱۷۰ زینے بلند ہے۔ سنگِ مرمر کی طرح سنگِ سبز کا بنا ہوا ہے۔

[1] کتبے کا ترجمہ یہ ہے: "اس فیروزی بالاخانے کے ناظرین کو معلوم ہو کہ شہنشاہ معادنِ خلافت ظل اللہ، جلال الدین محمد اکبر سلطانِ فاتح کے عہدِ حکومت میں یہ فدوی محمد طاہر عماد الدین حسین پسرِ سلطان علی سبزوار اس بلند عمارت کی تعمیر میں کامیاب ہوا۔ ماہ محرم سنہ ۱۰۱۳ھ (مئی سنہ ۱۶۰۵ء)"

کتبے کی عبارت کے لیے ملاحظہ ہو اسلامی ہندستانی کتبات سنہ ۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۱ء

حصے جو ثابت تھے ظاہر ہوئے۔ مقبرہ اندر سے ۶۵ فٹ ۳ انچ مربع ہے اور دیواریں ۱۱ فٹ ۳ انچ چوڑی ہیں۔ مقبرے کے ہر طرف تین در ہیں۔ درمیانی در زیادہ بلند ہے جیسا کہ شمالی دیوار کے اس حصے سے ظاہر ہے جو ابھی قائم ہے۔ کندہ کاری اور خطّاطی کے طرز نہایت بلند درجے کے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی معمار اس کی کندہ کاری کے لیے خاص طور پر مقرر کیے گئے تھے۔[1]

مقبرے کی اکثر قبروں کا پتا نشان کھودنے سے چلا۔ بیچ کی قبر محمود[2] کی ہے قبر کا تابوت شکستہ ہو چکا ہے لیکن اس کی زرد سنگِ مرمر کی کرسی جس پر نہایت خوب صورتی سے کندہ کاری کی گئی تھی باقی ہے اور قابلِ ستائش ہے۔ محمود کی قبر کے شمال میں ایک اور قبر ہے جس کا تابوت سنگِ مرمر کا ہے اور جنوب میں ایک تیسری قبر ہے۔ اس آخری قبر کا تابوت سرخ رنگ کا ہے۔ اس کے علاوہ وہاں تین اور مقبرے ہیں جن کے تابوت سرخ رنگ کے ہیں۔

محمود خلجی کے مقبرے کے وسط میں اگر کوئی شخص کھڑا ہو تو دیکھے گا کہ ہوشنگ کے مقبرے کے کمرے، جامع مسجد اور اس عمارت کا نقشہ اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ ان تینوں کا مرکز ایک ہی قطار میں ہے۔ محمود کے مقبرے کا ہال اپنے مقابل کے دونوں ہالوں سے عرض و طول میں بڑا ہے گنبد جو اس پر ہے وہ بہ نسبت ان گنبدوں کے جو جامع مسجد اور ہوشنگ کے مقبرے پر ہیں کم از کم ۲۵ فٹ زیادہ بلند ہوگا۔

---

[1] خطّاطی کے طریقے ہندستانی اسلامی فنِ تعمیر کی خصوصیات ہیں۔ ان کی تیاری کے لیے اکثر ایرانی ماہرینِ فن مقرر کیے جاتے تھے۔ ان عماروں میں بعض کے نام اس زمانے کے کتبوں میں محفوظ ہیں۔ ہندستانی اسلامی کتبات۔ ۱۹۱۵ء تا ۱۹۲۶ء

[2] اس کا انتقال ۱۴۶۹ء میں ہوا لیکن مقبرہ غالباً خود اس کی زندگی میں تعمیر ہو گیا ہوگا۔

یہ بات دل چسپ ہی کہ محمود خلجی کی دو خاص عمارتیں یعنی مینارِ فتح و مقبرہ جو بڑے شاندار پیمانے پر تعمیر ہوئیں اور بلند نظری کا پتا دیتی ہیں زمانے کا مقابلہ نہ کرسکیں اور اس کے مرنے کے دو سو برس بعد گر گئیں۔ سنگِ مرمر کی دیواروں کے ٹکڑے، قدیمی کندہ کاری اور مقبرے کا پختہ فرش یونانی عمارتوں کی یاد تازہ کرتے ہیں اور سیاح اگر غروبِ آفتاب کے بعد جب شام کے تاریک سایے اس مقام کی پراسرار دل کشی میں اضافہ کر رہے ہوں اس کی سیر کرے تو اس جگہ کا حسن اس کو مسحور کرے گا قدیم عمارتوں کے مجموعے کے بعد جن سے مانڈو کے قدیم مسلم الثبوت طرز کا اظہار ہوتا ہی شاہی احاطہ آتا ہی جہاں قرونِ وسطیٰ کے فنِ تعمیر کا پتا چلتا ہی۔ اشرفی محل سے ایک سڑک پہلے جامع مسجد اور ہوشنگ کے مقبرے کے چاروں طرف ہوتی ہوئی شمال کی جانب جاتی ہی جہاں ترپولیا مع فصیل کے ہی۔ دروازے کی محرابیں ماہر فن کی خاص دل چسپی کا سبب ہیں کیونکہ ان کی شکل بہ نسبت مانڈو کے غوری اور خلجی عمارتوں کی نکیلی محرابوں سے زیادہ ملتی جلتی ہی۔ دروازہ اپنے طرزِ تعمیر کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہی کہ سولھویں صدی کے آخر میں تعمیر ہوا تھا شاہی احاطے میں داخل ہونے کے بعد دروازے سے ملحق عمارت کا ایک ڈھیر نظر آتا ہی جس کو طویلی محل کہتے ہیں۔

"طویلی محل"

یہ ظاہراً "طویلہ محل" کی بگڑی ہوئی صورت ہی۔ طویلہ سے مراد ہی اصطبل اور یہ اصطبل سے زیادہ ہی بھی نہیں۔ اس کا دروازے سے اتنا قریب ہونا ظاہر کرتا ہی کہ یہ عمارت پہرہ داروں کی قیام گاہ تھی اور اصطبل نیچے زمین پر تھا۔ زمین کے اوپر دو منزلیں تھیں۔ کوٹھے پر سے کھنڈروں اور قرب و نواح کا

دل کش نظارہ نظر آتا ہے جنوب مشرق وجنوب مغرب میں چھوٹے چھوٹے نشیمنوں کے نشانات اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مختلف منزلوں میں ہر ایک درجے کی گہرائی جداگانہ ہے کیونکہ ہر ایک منزل اپنی نیچے والی منزل سے کچھ پیچھے ہسٹ کر واقع ہوی ہے۔

زمین کا فرش تین درجوں پر مشتمل ہے۔ بیرونی درجہ شاید گھوڑوں کے اصطبل کے لیے استعمال ہوتا تھا کیونکہ یہ اندر والے دونوں اصطبلوں سے کشادہ ہے جو چارے کے گودام اور سائیسوں کے رہنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ہر ایک درجے میں شمال کی جانب سات محراب دار در ہیں اور چھت چند محرابوں پر مشتمل تھی

پہلی منزل تک زینہ ہے جو عمارت کے مغربی سرے پر ہے۔ زمین کے فرش کی طرح اس کے بھی تین درجے ہیں لیکن بالکل اندر کا درجہ پہلے درجے کی سیاہ دیوار کی چوڑائی میں ہے[ل]۔ درجوں کی کل چوڑائی ۴۷ فٹ ہے اور دونوں بیرونی درجات میں ہر ایک ۱۱ فٹ کشادہ ہے لیکن اندرونی حصہ زیادہ وسیع ہے اور اس میں ایک لداؤ کی چھت ہے جس کو بھاری محرابیں سنبھالے ہیں۔ زمین کے فرش کی طرح اس منزل کے در جود ہیں سات محرابی در ہیں لیکن یہاں ان کے سامنے ایک کھلا ہوا چبوترا روش کی شکل میں ہے جو ۱۳ فٹ ۸ انچ کشادہ ہے۔

دوسرا زینہ طے کرنے کے بعد دوسری منزل آتی ہے جس کا دوہرا کمرہ

ل پشت (جنوب) کی دیوار تقریباً ۲۰ فٹ چوڑی ہے اور یہ تحقیق رائیگاں نہ ہوگی کہ آیا یہ ٹھوس ہے یا دیوار کے جنوب کی جانب نگہبانوں کے کمرے تھے جو اس کی چوڑائی میں بنائے گئے تھے۔

۴۹ فٹ لمبا ہی اور ۳۲ فٹ ۳ انچ چوڑا - وہ محرابیں جو اس کمرے کے داخلی درجے کی چھت کو سنبھالے ہیں ظاہراً کچھ پست ہیں - ان کا درمیانی فاصلہ ۱۳ فٹ ہی اور ستون ۹ فٹ بلند ہیں اور ان کی چوڑائی ۱۱ فٹ ۳ انچ ہی۔ اس منزل پر ایک کھلا ہوا چبوترا ہی جو ۴۱ فٹ کشادہ اور ساری عمارت کے سامنے پھیلا ہوا ہی -

"جہاز محل"

شاہی احاطے کے شمالی دروازے میں داخل ہوتے ہی اس خوب صورت عمارت کی جھلک نظر آتی ہی لیکن ھنڈولی محل کے سب سے بلند چبوترے سے اس کے دل کش ماحول کے حسن اور ان خوب صورت تالابوں کے نظارے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جن کے چاروں طرف گھنے درخت ہیں عمارت کا نام جہاز محل نہایت مناسب ہی کیونکہ اس کا اگلا رُخ ۳۶۱ فٹ ہی حالانکہ اس کا عرض مع دیواروں کی چوڑائی کے ۴۸ فٹ سے زیادہ نہیں ہی اور پھر جہاز کی تشبیہ یوں مکمل ہو جاتی ہی کہ کپور تالاؤ اور منجا تلاؤ [۵] اس کو سامنے (مشرق) اور پشت (مغرب) سے گھیرے ہوئے ہیں۔ اگلا رُخ ۳۱ فٹ ۶ انچ بلند ہی۔ چھت پر مختلف قسموں کے شہ نشین بنے ہیں جو عمارت کی دل کشی میں اضافہ کرتے ہیں۔ محل کی صحیح تاریخ تعمیر معلوم نہیں ہوئی لیکن وہ پُر مسرت طرز جو عمارت سے ظاہر ہی غیاث الدین کے عہد کی خصوصیت ہی اور یہ ممکن ہی کہ اس نے اپنے حرم کے لیے اس خوشنما محل کو تعمیر کرایا ہو۔

۵۔ تالاب کا نام منجا اژ بادشاہ منجا کے نام پر ہی جو دھار میں دسویں صدی کے آخر میں حکمراں تھا۔

اگلے رُخ کے نیچے حصے میں محراب دار دروں کا سلسلہ ہے جس کے اوپر ایک چھجا پتھر کی دیوارگیریوں پر قائم ہے۔ دیوار پر عسند لا کیا ہے جس پر چھوٹی چھوٹی محرابیں اور ابھرے ہوئے پانچ پتیوں کے پھول بنے ہیں۔ خاص دروازے پر محراب و نقش و نگار ہیں۔ اور پیل پایوں سے ملحق سنگ مرمر کے پتلے کھمبے ہیں جن پر سرخ افقی دھاریاں بنی ہیں۔

دروازے سے گزرنے کے بعد ایک دوہرا ہال ہے جو عرض و طول میں ۳۶ فٹ ۶ انچ اور ۵۵ فٹ ۶ انچ ہے۔ چھت ۶ ہموار ڈاٹوں پر مشتمل ہے جو بڑی بڑی محرابوں پر قائم ہیں۔ اس کے ستون ہال کے عرض و طول کو دیکھتے ہوئے زیادہ بھاری نظر آتے ہیں۔ اس ہال کی پشت پر مغرب کی جانب ایک خوب صورت شہ نشین منجلا تلاؤ کی طرف نکلی ہوئی ہے۔ اس کا نقشہ مربع ہے جو ہر طرف سے ۸ فٹ ہے لیکن اس کی زاویے دار کھڑکیوں نے اس کو اندر سے ستارہ نما بنا دیا ہے۔ بیرونی جانب سے شہ نشین ۲۸ فٹ مربع ہے اس کے تین جانب برآمدے[۱] ہیں جن میں جنگلے لگے ہیں۔ چھت گنبد نما ہے اور نیلے اور زرد ٹائیل سے مزین ہے۔

دوہرے ہال کے دونوں جانب غلام گردشیں[۲] ہیں جن کا طول ۳۶ فٹ ۶ انچ ہے اور عرض ۱۲ فٹ ۳ انچ ہے اور ہر ایک کے سامنے پہلے کے مثل دالان ہیں۔ مگر ان کے شہ نشیں جو منجا تالاب کی طرف نکلے ہوئے ہیں عرض و طول میں کم ہیں۔ ان کا نقشہ مستطیل ہے اور یہ دیوار سے ۵ فٹ نکلے ہوئے ہیں۔ ان میں پتھر کے چوکھٹے لگے ہیں اور محراب دار مستطیل در ہیں

---

[۱] سامنے برآمدہ ۵ فٹ ہے اور دونوں طرف ۳ فٹ ۲ انچ ہے۔

[۲] ان غلام گردشوں کی چھتیں لداؤ کی گولائی لے کر بنائی ہیں۔

جب خواتینِ حرم تشریف فرما ہوتی تھیں تو ان دروں میں پردے ڈال دیے جاتے تھے۔

ان بڑے کمروں کے آگے ہر ایک سرے پر (شمال و جنوب) ایک مستطیل کمرہ ہے جس کا طول ۳۶ فٹ اور عرض ۱۰ فٹ ۶ انچ ہے۔ کمرے کے جنوب کی جانب نہر کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس چھوٹی نہر سے ملی ہوئی تھی جو عمارت کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ اس کمرے سے جو شمال میں ہے ایک دروازہ دالان کی جانب ہے یہ دالان ایک نہایت خوب صورت حوض کے چاروں طرف بنا ہے۔ اس کی مثمن شکل ہے لیکن اس کے پہلو بجائے چورس ہونے کے محراب نما ہیں۔ اس حوض کا طول و عرض بالترتیب ۴۰ فٹ ۳ انچ اور ۶۳ فٹ ہے۔ ان لوگوں کی آسانی کے لیے جو تیرنا نہ جانتے ہوں ایک گھاٹ حوض کے درمیانی خلا کے چاروں طرف ہے۔ جب گرمیوں میں عشرت پسند شہزادے اور شہزادیاں یہاں نہانے کے لیے جمع ہوتے ہوں گے تو اس وقت خیال کیجیے کہ کیسے کیسے مذاق اور رنگ رلیاں وہاں ہوتی ہوں گی۔ شراب و موسیقی جذبات میں حشر برپا کر دیتے ہوں گے اور غالباً ناظرین نے شاہ نصیر الدین کا عالم سرخوشی میں گرنے کا واقعہ فراموش نہیں کیا ہوگا۔

حمام کے مغربی دالان کی پشت پر کچھ پرانی سیڑھیاں ہیں جو چبوترے تک جاتی ہیں۔ بعد میں شاید جہانگیر کے عہد میں ایک بے ڈول نئی عمارت کے سامنے جنوبی سرے پر تعمیر ہوا جس کے نیچے ایک خوب صورت آبشار چھپ گیا۔ محل کے صحن میں پہلے مختلف چشمے اور آبشار تھے جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

چبوترے پر چڑھنے کے بعد دو مستطیل شہ نشین نظر آتے ہیں جن کا عرض وطول ۹۳ فٹ ۹ انچ × ۱۳ فٹ ۵ انچ ہے۔ ان میں شمال و جنوب کی جانب محراب دار در ہیں اور مشرق و مغرب کی جانب صرف ایک ہے۔ ان دونوں دالانوں کی چھتیں تین حصّوں میں منقسم ہیں جن میں سے دو سرے والے کمروں کی چھتیں داخلی جانب سے شش پہلو ڈاٹوں پر مشتمل ہیں باہر سے مخروطی شکل ہے۔ بیچ والی چھت اندر اور باہر دونوں طرف سے گنبد نما ہے۔ معمار نے تنوّع سے عمارت میں دل کشی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ستون جو شہ نشین کی محرابوں کو سنبھالے ہیں اینٹ چونے وغیرہ کے بنے ہیں اور اوپر صندلا ہے۔ عمارت کے سامنے محراب دار در اور چھجّوں کے اوپر بھی اسی طرح صندلا کیا گیا ہے۔ اس خصوصیّت سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں پتّھر لگانے کا شوق جو مانڈو کی ابتدائی عمارتوں کی خصوصیت تھی فراموش کر دیا گیا اور معماروں نے فن کارانہ اثر پیدا کرنے کے لیے اثر پذیر لیکن کم دیر پا مسالہ لگانا شروع کر دیا۔

چبوترے کا طول و عرض ۲۰۵ فٹ × ۸۴ فٹ ہے۔ یہاں سے مانڈو کی پہاڑی اور سونگڈھ کی پہاڑی کا بہترین منظر نظر آتا ہے۔ ہندستان کے غروب آفتاب کے وقت شفق میں قدرتی نظاروں کا صحرائی حسن اور گنبدوں اور میناروں کا مسلسل منظر ایک ایسا نظارہ پیش کرتے ہیں جو شاید اس منظر سے کم دل کش نہیں جو بروپیلیم سے اس وقت نظر آتا ہے جب یونانی فنِ تعمیر کے مقدس کھنڈر سنہری روشنی سے منوّر ہوتے ہیں۔ یونان کی مختلف پہاڑیاں گوناگوں رنگوں سے جگمگا اٹھتی ہیں اور دور پر سمندر ایسا جھلکتا ہے

جیسے پگھلا ہوا سونا۔

چبوترے کے مغربی پہلو کے وسط میں ایک مربع شہ نشین نکلا ہوا ہے جو ہر طرف سے اندر کی جانب ۱۸ فٹ ۶ انچ ہے۔ یہ اس شہ نشین کے بالکل اوپر ہے جو اوپر بنا ہے چھت گنبد نما ہے اور کنگورے جن میں پانچ نوکیں ہیں اُن پر مینا کاری کا کام ہے اور چھجوں کے اوپر جو کنگورے ہیں وہ سہ گوشیہ ہیں۔ شہ نشین کے اندر ہوا اور روشنی کے لیے نہایت نفیس کھڑکیاں ہیں۔ ان کی شکل ہشت پہلو ستارے کی ہے لیکن نوکیں بجائے کونے دار ہونے کے چوٹی دار ہیں۔ وہ نوکیں جو کرسی اور اوپر کے سرے پر ہیں ان میں چوٹیاں محراب کی طرح کونے دار ہیں۔ شہ نشین کے اندر اور باہر نیلے اور زرد رنگ کے ٹائیل لگے ہیں اور تصاویر کے کچھ آثار اب بھی ہیں جن میں پھول پتیاں بنی ہیں۔

شہ نشین کے سامنے چبوترے کے دوسری جانب (مشرق) ایک چھتری ہے جس کی شکل دیدہ زیب ہے۔ کرسی کے پاس اس کا نقشہ مستطیل ہے لیکن چھت شش پہلو ہے اور اس کی بیرونی شکل مخروطی ہے۔ چھتری کے ہر طرف تین کڑی دار در ہیں۔

چبوترے کے سامنے ایک نہر ہے جو جنوبی شہ نشین کے جنوبی مشرقی کونے سے شروع ہوتی ہے جہاں پانی کی ڈھیکلی ہے۔ یہ نہر اس کھلے ہوئے حمام تک جاتی ہے جو چھت کے شمالی سرے کے پاس ہے۔ یہ حمام طرز میں ویسا ہی ہے جیسا زمین کے فرش کا اور اس کا طول و عرض نسبتاً کم ہے۔ طول ۳۸ فٹ ۸ انچ عرض ۳۷ فٹ ۲ انچ اور عمق ۶ فٹ ۱۰ انچ ہے۔ حمام کے نیچے کشادہ سیڑھیاں اور چبوترے ہیں جن پر وہ لوگ آرام کرتے تھے جو تیرنے میں مشاق نہیں ہوتے تھے۔ نہر جو حمام کے جنوب

مشرق کے گوشے میں ہی اس کا طرز نہایت ہی خوشنما اور قابلِ دید ہی۔

ایک ماہر فنِ تعمیر کو جہاز محل میں باوجود اس کی خوشنمائی کے یہ کمی محسوس ہوتی ہی کہ اس میں مانڈو کا وہ ابتدائی طرز نہیں ہی جس میں ترتیب کی سادگی اور اسلوب کی اثر آفرینی اصل مدعا تھے۔

ان دونوں تالابوں میں جو جہاز محل کے کنارے ہیں کپور تلاؤ چھوٹا ہی کسی زمانے میں اس کے چاروں طرف اینٹ چونے وغیرہ کے کنارے تھے اور پانی کے وسط میں ایک شہ نشین تھا جس میں پتھر کا راستہ تالاب کے مغربی کنارے سے تھا۔ دونوں شہ نشین اور پتھر کا راستہ اب شکستہ ہوگئے ہیں۔

ایک محراب دار زمین دوز نہر کپور تلاؤ کو منجا تلاؤ سے ملاتی ہی جو عرض و طول میں اول الذکر سے بڑا ہی اور ۵۰۰ فٹ مربع ہی۔ منجا تالاب کے شمالی کنارے پر شاہی محلات کے کھنڈر ہیں جن کا بیان آگے آتا ہی۔

"شاہی محلات اور چمپا باؤلی"

حوادثِ روزگار نے شاہانِ مالوہ کے عشرت کدوں کو تباہ و برباد کر دیا ہی اور سیاح اب بھی اس مقام پر جہاں ایک عظیم الشان عمارت تھی ایک پیپل کا درخت دیکھے گا جو اپنی بلند شاخوں میں عمارت کا اینٹ پتھر چونا وغیرہ لیے ہوئے ہی۔ ان کی موجودہ تباہ حالت میں ان کے نقشے کا پتا چلانا مشکل ہی لیکن ایک شخص کسی کندہ ستون یا اس میناکاری کی جھالر سے جو مٹی کے ڈھیر میں گری پڑی ہی ان کے قدیم حسن و عظمت کا

اندازہ لگا سکتا ہے۔

جہاز محل کے شمال مغرب میں کھنڈروں کے نزدیک ایک کنواں ہے جس کا نام چمپا باؤلی[1] ہے۔ باؤلی کے اندر جانے کا ایک نیچے سے راستہ ہے جو باؤلی کو اس تہ خانے سے ملا دیتا ہے جس میں شاہی محلات کے باشندے گرمیوں میں آجاتے تھے جب کہ آفتاب کی تمازت وحدت محلوں میں ناقابلِ برداشت ہوتی تھی۔ یہ کمرے منجاتالاب کے پانی کی سطح کے برابر ہیں اور ایک غلام گردش اس شہ نشین کو جاتی ہے جو اس کے مغربی کنارے پر ہے۔ تہ خانے سے زینہ باؤلی کو جاتا ہے جو ۱۸ فٹ مربع ہے۔ باولی کے چاروں طرف دیواریں محراب دار طاق ہیں اور اس کے سامنے ایک پختہ فرش ۴ فٹ ۲ انچ کشادہ اور پانی کی جانب ہے۔ ہوا اور روشنی کے لیے کنوئیں کے اوپر کا حصہ کھلا ہوا ہے اس کے چاروں طرف ایک پتھر کا جنگلا محض احتیاط کے لیے لگا ہے کہ کوئی آدمی یا جانور گر نہ جائے۔

شاہی احاطے کی شمالی دیوار کے نزدیک بادشاہوں کے رہنے کے محلات تھے اور منجاتلاؤ کی سطح آب سے کہیں زیادہ بلندی پر تھے۔ ایک قدیمی محل کے جنوبی مشرقی سمت میں چمپا باؤلی کے نزدیک حمام کے آثار نظر آتے ہیں۔ اس حمام کی چھت میں روشنی کے لیے خوب صورت ستارے کٹے ہوئے ہیں۔ حمام کے نزدیک مختلف عمارتوں کے کھنڈر گول ستون اور سنگ مرمر کی گول سلیں نظر آتی ہیں۔ مانڈو کی ابتدائی عمارتوں میں ستون مربع ہیں اور جب ستونوں کا رواج ہوا تو وہ بہت بھدے بنائے گئے لیکن وہ عمارتیں جو عہدِ غیاث الدین کے آخر میں تعمیر ہوئیں یا اس کے لڑکے

---

[1] باولی کا یہ شاعرانہ نام اس کے خوش ذائقہ پانی کی وجہ سے رکھا گیا تھا۔

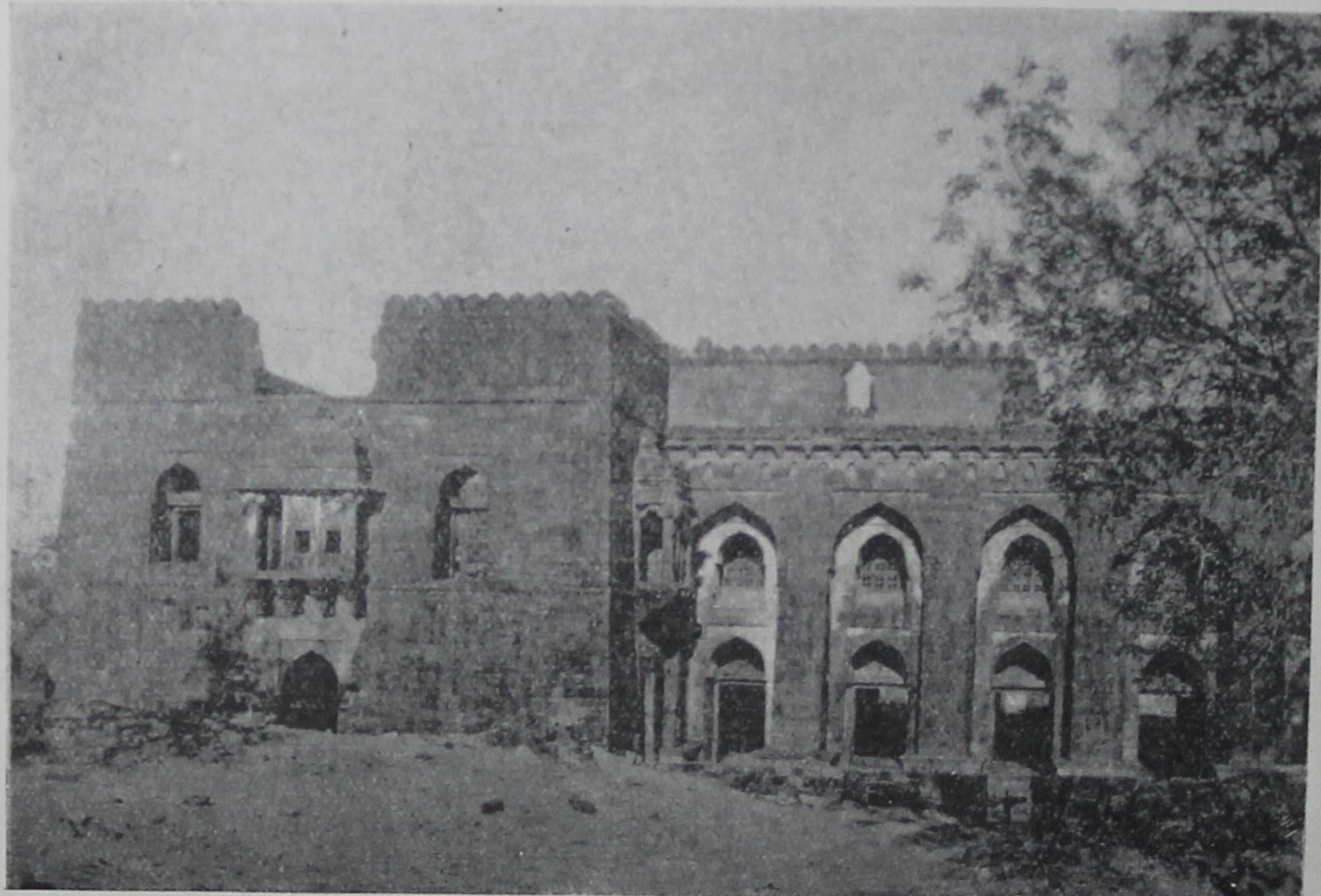
نصیر الدین کے عہد میں بنائی گئیں ان کے نقشے نہایت دل کش ہیں۔ مثلاً محلات کے کھنڈروں سے اس شہ نشین کو جاتے ہوئے جو منجا تالاب کے مغربی کنارے کے نزدیک ہی اینٹ چونے کے زبردست گول ستون پختہ راستے کے قریب نظر آتے ہیں۔ ان ستونوں کے گھیر بہت بڑے ہیں لیکن خود شہ نشین بعد کی عمارت معلوم ہوتی ہے اور اس کے سنگِ مرمر کے ستونوں سے عمدہ احساسِ تناسب کا پتا چلتا ہے۔

یہ شہ نشین نہایت دل کش مقام پر واقع ہے، قطعِ نظر اس کے یہ فنِ تعمیر کے اعتبار سے نہایت عمدہ عمارت ہے۔ عمارت کے خاص شمالی و مشرقی رُخ سنگِ مرمر کے بنے تھے جن پر نہایت ماہرانہ طرز سے منبت کاری کی گئی تھی اور نیلے اور زرد چوکے لگائے گئے تھے۔ ان میں سے بعض پر کوفی کتبات کندہ ہیں۔ اس عمارت کا جو حصہ باقی رہ گیا ہے وہ دو ہال ہیں جن کی ڈاٹ کی چھتیں ہیں ان میں سے ایک ہال کے کنارے پر ستارے نما کھڑکیاں ہیں جو قابلِ دید ہیں۔

شاہی احاطے جو شمال سے جنوب تک ۵۵۰ گز اور مشرق سے مغرب تک ۴۹۰ گز تک پھیلا ہوا ہے سب سے قدیمی عمارت وہ مسجد ہے جو دلاور خاں غوری سے منسوب کی جاتی ہے۔ وہ مالوہ کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔ لیکن یہاں پہنچنے سے پیشتر ایک لمبی چوڑی مگر خوب صورت عمارت نظر آتی ہے جس کا نام ہنڈولا محل ہے۔

"ہنڈولا محل"

ہنڈولے کے معنی ہندی میں جھولے کے ہیں اور محل کا یہ نام اس



ہندولا محل

سبب سے ہوا کہ اس کی دیواریں بہت جھکی ہوئی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمارت جھول رہی ہے۔ ہنڈولا محل کا فنِ تعمیر سادگی و حسنِ تاثیر میں جہاز محل یا ملک مغیث کی مسجد سے جداگانہ ہے۔ بعد الذکر مسجد ۱۴۳۲ء میں محمود خلجی کے عہد میں تعمیر ہوئی تھی اور اس کا ذکر آگے آئے گا۔ یہ آخری دو عمارتیں اپنے باریک کام میں معماروں کے حسنِ تخیل کا اظہار کرتی ہیں لیکن ان میں ہم آہنگی کی کمی ہے اور طرزِ تعمیر میں عموماً کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ ہنڈولا محل ان عمارتوں کے مقابلے میں گویا تعریضاً تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے سن تعمیر کا تعین غیاث الدین کے آخر عہد یعنی پندرھویں صدی کے آخر میں ہوتا ہے۔

عمارت کا نقشہ ایک صدر ایوان پر مشتمل ہے جو اندر سے طول و عرض میں ۸۸ فٹ ۵ انچ اور ۲۴ فٹ ۸ انچ ہے۔ اسی کے ساتھ ایک حصہ شمال میں نکلا ہوا ہے جس کی شکل انگریزی حرف T کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت بعد میں بڑھائی گئی کیونکہ عمارت کے بیرونی جانب جو مسلسل کندہ کاری کی گئی ہے وہ اس نکلے ہوئے حصے کے چاروں طرف نہیں ہے بلکہ ایوان کے پہلوؤں پر دفعتہً ختم ہو جاتی ہے۔ ساری عمارت باہر سے طول میں ۱۵۶ فٹ ہے اور شمالی سرے پر ۱۱۲ فٹ عرض ہے لیکن جنوبی سرے پر محض ۵۵ فٹ ہے اندر کے حصے میں ہر طرف چھ محراب دار در ہیں اور چھ دوہری محرابیں اور ایک اکیلی محراب چھت کو سنبھالے ہے جو غالباً[1] قاب نما ڈاٹوں پر مشتمل تھی اور چونکہ عمدہ طریقے سے تعمیر نہیں ہوئی تھی اس لیے گر گئی۔ دروں کے سر محراب میں کٹاؤ کا نازک کام کیا گیا ہے

---

[1] اس کے مقابلے میں بیجاپور میں سلطان ابراہیم کے روضے کی ہموار چھت آج تک سالم ہے۔

روشنی اور ہوا کے لیے دروں کے اوپر کھڑکیاں ہیں جن میں دل کش طرز کے کٹاؤ کا کام ہے۔

مشرق و مغرب کی دیواریں ۹ فٹ چوڑی ہیں۔ ان بڑی محرابوں کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے جو چھت کو سنبھالے ہیں معمار نے دیواروں کو پشتوں سے مضبوط کر دیا ہے۔ یہ پشتے اوپر کی جانب ڈھالو ہیں اور تقریباً ۷ فٹ ۶ انچ نکلے ہوئے ہیں۔ عمارت کے بیرونی جانب ایک یا دو آرائشی حاشیے ہیں لیکن عمدہ تراشی ہوئی اینٹیں اور ان کے نفیس جوڑ عمارت کو خوشنما بنا دیتے ہیں۔

بادشاہ ہنڈولا محل کو غالباً بطور دیوانِ عام کے استعمال کرتے تھے اور شمالی سرے پر وہ T کی شکل کا نکلا ہوا حصہ اس وقت تعمیر ہوا جب بادشاہ کے لیے زیادہ محفوظ راستے کی ضرورت پیش آئی۔ اس حصے کی اندر سے صلیب نما شکل ہے اور شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کے راستے یہاں ملتے ہیں۔ خاص راستے کی چھت (از شمال بہ جنوب) حصوں میں منقسم ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی میں بنائی گئی ہے کیونکہ مرکزی حصے کے کندہ پتھر کسی شکستہ ہندو مندر سے لا کر بغیر کسی ردوبدل کے لگا دیے گئے۔

اس نکلے ہوئے حصے کی دوسری منزل بیگمات کے لیے تھی جس پر دو مختلف راستے جاتے ہیں۔ خاص راستے کا دروازہ شمال کی طرف ہے جہاں سے ڈھالو چبوترے جن کا نام "ہاتھی چڑھاؤ" ہے اوپر کے حجروں کا راستہ ہیں چبوترے ان زینوں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو اشبیلیہ اور رابت اور ہندستان کے نزدیک تر قاہرہ[1] اور سمارہ کے میناروں میں بنے ہیں

---

[1] قاہرہ اور سمارہ کے میناروں کے زینے پُر پیچ ہیں۔

مانڈو میں معمولی زینوں سے یہ چبوترے یا چوڑی سیڑھیاں زیادہ پسند کی جاتی تھیں غالباً خواتین کی آسانی کے لیے جو پالکی میں بیٹھی ہوئی یا گھوڑے پر اوپر جاتی تھیں حالانکہ ہاتھی چڑھاؤ کے نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہاتھی سیڑھیوں پر چڑھ سکتا تھا۔

اوپر کی منزل کی چھت گر گئی ہے لیکن ستونوں کی کرسیوں سے اس کی ترتیب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک دالان[1] تھا جو طول میں ۶۹ فٹ اور عرض میں ۳۹ فٹ ۴ انچ ہے۔ یہ تین بغلی راستوں میں منقسم ہے لیکن ستونوں کا درمیانی وقفہ یکساں نہیں ہے مثلاً دوسرے اور تیسرے کھمبوں کے درمیان فاصلہ بہ نسبت دوسرے کھمبوں کے زیادہ ہے۔ ستونوں کی ترتیب پہلو کی دیواروں کی کھڑکیوں سے کچھ مطابقت نہیں رکھتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیشتر کی ہیں۔ یہ اندازہ اور مستحکم ہو جاتا ہے جب ہم اس بالائی حصے کے چونے اینٹ کو دیکھتے ہیں جس پر چھت قائم تھی۔ یہ حصہ عمارت کی اصلی دیواروں کے عمدہ اینٹ چونے کے مقابلے میں بالکل بے جوڑ ہے۔

کھڑکیاں عمارت کی دل کش خصوصیت ہیں۔ عمارت کا بے کیف دکھاوا جیسا مشرقی رُخ سے نظر آتا ہے ان خوب صورت متعلقات کے اضافے سے مغربی جانب بہت کچھ کم ہو جاتا ہے۔ یہ نقشے میں مستطیل ہیں اور اس کی نیم مخروطی چھت ہندو مندر کے نیم مینار سے بیحد مشابہت رکھتی ہے وہاں سے خواتین حرم سواروں کے ان دستوں کو دیکھتی تھیں جو ایوان کے پاس سے

---

[1] عمارت کا سب سے پہلا حصہ ایوان ہے جس میں بعد کو T کی شکل کا درجہ شامل کیا گیا۔ بعد الذکر کی کھڑکیاں اسی زمانے میں بنی لیکن اوپر کا دالان یقیناً بہت بعد کے زمانے کی تعمیر ہے۔

گزرتے تھے۔ ان کے پردے کے لیے کھڑکیوں کے دروں میں عمدہ قسم کی جعفری لگی تھی۔[1]

دلاور خاں کی مسجد

ہنڈولا محل کا ایک گھرا ہوا راستہ دلاور خاں کی مسجد کو جاتا ہے جو شاید شاہی محل کے لیے مخصوص تھی کیونکہ مسجد کے خاص دروازے جو مشرق و شمال کی جانب ہیں ان میں زینے ہیں۔ ابھی حال میں جب کھدائی کی گئی تو اس مقام پر جہاں راستہ ختم ہوتا ہے زینے کا پتا اس کتبے سے چلا جو مشرقی دروازے پر کندہ ہے یہ مسجد ۱۴۰۵ء میں تعمیر ہوئی اور مانڈو میں یہ سب سے پہلی اسلامی عمارت ہے جس پر تاریخ کندہ ہے فنِ تعمیر کا بنگالی طرز ہے اور اس میں سوائے نماز گاہ اور

---

[1] قلعہ ورنگل میں ایک عمارت شتاب خاں کی کچہری ہنڈولا محل کا نقشِ ثانی ہے۔ اس کا دالان ۸۰ فٹ × ۴۶ فٹ ہے اور اس کی چھت جہاز محل کی چھتوں کی طرح قاب نما ڈاٹوں سے بنی ہے جو گر گئی ہیں۔ چونکہ شتاب خاں کی کچہری اور ہنڈولا محل کی بہت سی خصوصیات ملتی جلتی ہیں اس لیے یہ ناممکن ہے کہ دونوں کو تعمیر کرنے والا ایک ہی معمار ہو یا یہ کہ اس کا معمار بعد کی عمارت سے واقف ہو۔ پندرھویں صدی کے اخیر اور سولھویں صدی کے آغاز میں مالوہ اور دکن میں بہت ربط ضبط تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ دکن کی یہ عمارت ہنڈولا محل کے بعد ہی تعمیر ہوئی ہے۔ معاصر تاریخ کے بموجب پندرھویں صدی کے آخر میں شتاب خاں بہمنیوں کے عہد میں ورنگل کا حاکم تھا۔ لیکن بعد میں ورنگل کے راجاؤں سے سازش کی اور سلطان قلی سے شکست کھائی۔ سلطان نے ورنگل ۱۵۱۳ء و ۱۵۱۶ء کے درمیان میں حاصل کیا اس عمارت کے متعلق زیادہ معلومات سالانہ رپوٹ محکمۂ آثار قدیمہ سے حاصل ہو سکتی ہے رپورٹ ۱۹۲۵ء و ۱۹۲۶ء۔ ص ۱۱-۱۲۔

مشرقی دروازے کے طاقوں کے بہت کم ایسی چیزیں ہیں جن کو خالص اسلامی سمجھا جائے۔

عمارت کا نقشہ ایک مرکزی صحن (۹۶ فٹ × ۸۹ فٹ ۵ انچ) پر مشتمل ہے جس کے چاروں طرف ایک دالان ہے یہ شمال مشرق اور جنوب میں ۷ فٹ ۱۱ انچ چوڑا ہے اور مغرب کی جانب اس کا چوگنا زیادہ جس میں نماز گاہ ہے جو ۱۰۵ فٹ ۵ انچ طول میں اور ۳۲ فٹ ۳ انچ چوڑی ہے۔ دالانوں کے ستون مختلف طرز کے ہیں اور ان سے ہندوانہ صناعی کا اظہار ہوتا ہے۔ نماز گاہ کی چھت ہندو طرز کی بنی ہوئی ہے جس کو ان درجات میں تقسیم کیا گیا ہے جو ستارہ نما یا مسطح ہیں۔

نماز گاہ کی مغربی دیوار میں سات محرابیں ہیں۔ درمیانی محراب میں بہت آرائشی کام ہے۔ اس کی محرابوں کے کھمبوں پر دھاریاں کندہ ہیں اور پتھر میں نہایت نازک کام کیا گیا۔ سر محراب پر منقش روزن ہیں پشت کا طاق سنگِ سیاہ سے آراستہ ہے جس کا صندلا نہایت خوب صورت ہے۔

نماز گاہ میں صحن کی جانب ۱۳ درجے ہیں اور اس کے اوپر ایک نیچی گگر پر پتنیا کام ہے۔ چونکہ کنگورے گگر پر نہیں ہیں اس لیے نماز گاہ کا رُخ نامکمل نظر آتا ہے۔

مسجد کا بڑا دروازہ مشرق کی طرف پھول دار مرغولوں اور طغروں سے آراستہ ہے شمال وجنوب کی جانب چھوٹے چھوٹے دروازے ہیں لیکن ان میں زینے نہیں ہیں ساری عمارت باہر سے ۱۳۷ فٹ ۱۱ انچ × ۱۱۲ فٹ ۹ انچ ہے۔

"نہر جھروکا"

دلاور خاں کی مسجد کے مشرق میں ایک وسیع مربع صحن ہے جہاں مانڈو

کے عہدِ عروج میں بادشاہ کے درشن کے لیے لوگ ہر صبح جمع ہوتے تھے۔ اس صحن کے جنوبی کنارے پر کھنڈر ہیں جن کو "نہر جھروکا" کہتے۔ بادشاہ اپنی وفادار رعایا کو اس جھروکے سے درشن دیتا تھا جو ابھی حال میں گر گیا ہو۔ یہ سنگِ مرمر کا بنا ہوا تھا اور شیر کی مورت پر قائم تھا۔ اس سبب سے اس کا نام "نہر جھروکا" ہوا۔ تاریخ ہند کے طالب علم کے لیے یہ بات کچھ کم دل چسپ نہیں کہ اس جھروکے کی بنا پر یہ تسلیم کیا جا سکتا ہو کہ مالوہ کے مسلمان بادشاہوں نے اکبر سے بھی پہلے درشن کی رسم اختیار کر لی تھی لیکن جھروکے کی پشت پر عمارت کا طرز اس مفروضے کی تائید نہیں کرتا اور یہ ممکن ہو کہ جب جہانگیر مانڈو میں قیام کرنے آیا تھا تو اس کے امیرِ عمارت نے شہنشاہ کے صبح کے درشن کے لیے یہ عمارت تعمیر کرائی ہو۔

جھروکے کی پشت پر جو عمارتیں ہیں ان کا گھانس پھونس صاف نہیں کیا گیا ہو ان میں بہت سے دو منزلہ کمرے ہیں۔ زمین کے فرش پر صدر میں ایک تیہرا دالان ہو جس کے مشرق و مغرب میں دو پہلو کے کمرے ہیں۔ بڑے دالان کا ہر ایک حصہ ۲۱ فٹ × ۱۰ فٹ ۶ انچ ہو۔ پہلو کا ہر ایک کمرہ ۳۶ فٹ × ۱۰ فٹ ۶ انچ ہو ان کے آگے ہر سرے پر تین حجرے ایک طرز کے ہیں جن کا عرض و طول ۱۰ فٹ ۶ انچ مربع ہو۔ دالان اور ان کمروں کی چھتیں اتھلی ڈاٹوں کی ہیں لیکن طاق، دیواروں کی تصاویر اور محرابوں کے پلاسٹر کا کام ظاہر کرتا ہو کہ یہ مغلیہ عہد میں تعمیر ہوئے اور غالباً اس زمانے میں جب جہانگیر نے مانڈو میں قیام کیا تھا دوسری منزل کے کمروں کی آرائش اس خیال کی تائید کرتی ہو

نہر جھروکے کے مغرب میں چند گز پر شاہی احاطے کی دیوار میں ایک

قدیمی دروازہ ہی جواب بند کر دیا گیا ہی۔ اس دروازے کی پشت پر ایک چھتا ہی جو تین درجوں پر مشتمل ہی اور جن کا کل طول و عرض ۶ ۵ فٹ × ۳۵ فٹ ہی۔ اس عمارت کی محرابوں اور ستونوں سے نہایت عمدہ تناسب کا اظہار ہوتا اور پتا چلتا ہی کہ مانڈو کے قدیم بادشاہوں نے اس کو تعمیر کرایا ہی۔

"ہاتھی پول دروازہ"

شاہی احاطے کے شمالی دروازے کا نام ہاتھی پول دروازہ ہی اس کے دونوں طرف چبوتروں پر دو ہاتھیوں کی مورتیں ایستادہ ہیں۔ مورتیں مکمل نہیں ہیں سونڈ اور پیٹھ اب غائب ہو گئی ہیں۔ پیٹ اور پیر ابھی باقی ہیں اور چبوترے سے ½۵ فٹ بلند ہیں۔ مورتیں اینٹ چونے وغیرہ کی بنی ہوئی ہیں۔ ٹکڑوں کو جوڑ کر پلاسٹر کر دیا گیا ہی۔ چبوترے جن پر مورتیں کھڑی ہیں ۲۵ فٹ ۱۰ انچ × ۱۳ فٹ ۶ انچ ہی اور زمین سے ۷ فٹ ۸ انچ بلند ہیں۔ دروازے کے دونوں طرف دیواروں میں گول برج توپیں رکھنے کے لیے بنے ہیں۔

دروازے میں دو بلند محرابیں راستے کے ہر سرے پر بنی ہیں مدائے پر چھت گول ڈاٹ کی بنائی ہی۔ راستے کے ہر طرف چھوٹے چھوٹے کمرے پاسبانوں کے لیے بنے تھے۔ دونوں محرابوں کے بیچ کا راستہ طول میں ۲۰ فٹ ۴ انچ ہی اور کشادگی ۱۱ فٹ ۳ انچ ہی محرابوں کی شکل بتاتی ہی کہ دروازہ سولھویں صدی یا کچھ بعد تعمیر ہوا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ دروازہ کس نے بنایا؟ اکبر نے رانا چتوڑ پر

فتح پانے کی یادگار میں قلعۂ آگرہ کے دروازے کے سامنے ہاتھیوں کی دو مورتیں بنوائی تھیں اور معاصرانہ تحریروں میں اس دروازے کا ذکر ہاتھیا پول دروازے کے نام سے آیا ہے۔ مانڈو کے ہاتھی پول دروازے کے برج اور محرابیں اس خیال کی تائید نہیں کرتیں کہ بعد الذکر دروازہ مالوے کے قدیم بادشاہوں کا تعمیر کرایا ہوا ہے۔ مورتوں کی کندہ کاری سے کسی خاص مہارت کا اظہار نہیں ہوتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی میں بنائی گئی ہیں۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں اپنے امیرِ عمارت کی تعریف اس بنا پر کی ہے کہ اس نے شہنشاہ کے قیام کے لیے مختلف عمارتیں تعمیر کی تھیں۔ ان اسباب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ ناممکن نہیں معلوم ہوتا ہے کہ عبدالکریم جہانگیر کے امیرِ عمارت نے شہنشاہ کی خوشنودی کے لیے مانڈو میں قلعۂ آگرہ کے ہاتھیا پول دروازے کی طرح ایک دروازہ تعمیر کیا ہو اگرچہ وہ اتنا شاندار نہ ہو۔

شاہی احاطہ چھوڑنے سے پیشتر دو کنویں نظر آتے ہیں جن کا شاعرانہ نام اجالا باؤلی اور اندھیری باؤلی ہے۔ چونکہ محل میں پینے کا پانی چمپا باؤلی اور ان دونوں کنووں سے آتا تھا اس لیے ان کو نجاست سے بچانے کے لیے حفاظت پوری طرح کی گئی ہوگی۔

"اُجالا باؤلی"

یہ گہرا اور بڑا کنواں ہے اور دونوں طرف سے (مشرق و مغرب) زینے سطحِ آب تک جاتے ہیں۔ چونکہ یہ سطح موسموں کے مطابق تبدیل ہوتی ہوگی اس لیے مختلف سطحوں کے لحاظ سے بہشتیوں کی آسانی کے لیے کنویں

کی دیوار میں چھتے اور چبوترے بنائے گئے ہوں گے۔ باؤلی کے شمالی طرف اوپر پانی کی چرخی ہے اور جنوب میں ایک شہ نشین ہے جس میں شاہی نگہبان جو پانی کی نگہبانی کرتے تھے رہتے ہوں گے ہر ایک کشادہ سیڑھی پر پاسبانوں کے لیے کمرہ ہے۔ ٹیری نے اسی پہرا چوکی کی سختی کا ذکر سر ٹوس رو کے حالاتِ سفارت میں کیا ہے اور ہم اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔[1]

کنویں کے کنارے سطحِ آب کے پاس ۳۸ فٹ × ۳۵ فٹ ۹ انچ ہیں

"اندھیری باؤلی"

اجالا باؤلی کے جنوب مغرب میں بالکل قریب اس کی حریف اندھیری باؤلی واقع ہے اس سبب سے اس کا یہ نام ہوا کہ غلام گردشیں جو اس کے چاروں طرف ہیں اور راستہ جو پانی تک جاتا ہے اوپر سے بند ہیں لہذا بالکل تاریک ہیں۔ کنویں کے چاروں طرف ایک دوہری محراب کی غلام گردش ہے جس میں مشرق و مغرب کی جانب سات در ہیں اور جنوب و شمال کی طرف پانچ در ہیں۔ غلام گردشوں کی چھت پر بیچ میں، کنویں سے ذرا اوپر ایک گنبد ہے جس کی چوٹی پر ایک شگاف کنویں میں ہوا اور روشنی کے لیے بنا ہے۔ غلام گردش سے زینہ دوسری منزل کو جاتا ہے جہاں ایک خوب صورت محراب دار برآمدہ کنویں کے چاروں طرف بنا ہے۔ ایک تیسری منزل بھی ہے

[1] پانی کی کمی کے متعلق کوریٹ لکھتا ہے "میرے آقا کے ملازمین میں سے کسی نے پہلے ہی دن ایک چشمے کا پتا لگا یا۔ جو اگر وہ نہ لگاتا تو اس کو ہر روز ۱۰ کوس پانی کے لیے دریائے نربدا تک جانا پڑتا۔ خشک سالی کے زمانے میں دو مسلمان امیر دس اونٹ روزانہ پانی لانے کے لیے نربدا بھیجتے تھے اور یہ پانی غربا کو تقسیم کیا جاتا تھا۔" جلد سوم۔

بعد الذکر کے نیچے تک زینے ہیں لیکن پانی ہمیشہ ان کے اوپر رہتا ہے سطح آب کے نزدیک طول و عرض ۱۲ فٹ ۱۰ انچ مربع ہے۔

"گدا شاہ کی دکان"

یہ لقب غلط[1] ہے کیونکہ یہ عمارت بجائے دکان کے ایک دیوان خانہ ہے جو ہنڈولا محل کے طرز پر تعمیر ہوا لیکن اس سے کہیں زیادہ بڑے پیمانے پر بنایا گیا۔ عمارت اندر سے طول میں ۱۳۰ فٹ ہے اور عرض ۳۱ فٹ۔ چھت زبردست محرابوں پر قائم تھی جن میں سے دو (۳۰ فٹ ۶ انچ) اب بھی قائم ہیں۔ محرابوں کے وزن کو روکنے کے لیے دیواروں کے مضبوط پشتے بنائے گئے ہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ گھاس پھونس میں ایسی پوشیدہ طاقت کہاں سے آگئی کہ اس نے اتنے زبردست ڈھیر کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا دیے۔

عمارت کی دیواروں پر پلاسٹر ہے اور رنگین چوکوں کی آرائش کے آثار اب بھی ظاہر ہیں۔

ہال کے عظیم الشان طول و عرض سے پتا چلتا ہے کہ یہ بادشاہ کا دربار عام تھا اور ہنڈولا محل دربار خاص۔ ان دونوں کا شاہی محلات کے نزدیک ہونا اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کیونکہ ہنڈولا محل محلات کے بالکل پاس ہے اور گدا شاہ کی دکان کافی فاصلے پر۔

گدا شاہ کا مکان

گدا شاہ کی دکان کے جنوب مغرب میں یہ مکان ہے لیکن ہنڈولا محل کے

---

[1] تاوقتیکہ اس خیال کو تسلیم نہ کیا جائے کہ میدنی رائے کا (بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۸۵ پر)

سامنے سے جو سڑک گزرتی ہے اس سے بآسانی ہم یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔

اس عمارت سے مغلیہ فنِ تعمیر کے اثرات کا پتا چلتا ہے اور معلوم ہوتا کہ سولھویں صدی کے آخر یا بعد میں تعمیر ہوئی ہے۔ یہ دو منزلی ہے۔ نیچے کے درجات ملبے سے بھرے ہوئے ہیں۔ اوپر کی منزل میں ایک ہال ۳۲ فٹ × ۱۳ فٹ ۴ انچ ہے صدر میں ایک فوارہ ہے جس کا ضرورت سے زیادہ پانی دو ٹونٹیوں کے ذریعے سے نکال دیا جاتا ہے۔ ایک ٹونٹی کی شکل ہاتھی کے سر کی ہے اور دوسری شیر کی۔ دونوں ابھی اچھی حالت میں ہیں۔ اس ہال کی چھت میں چوبی شہتیر تھے جس کے ٹکڑے دیواریں بعض مقامات پر نکلے ہوئے ہیں۔ ہال کے ہر کنارے پر شمال وجنوب کی جانب چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔

عمارت کا اگلا رُخ تصاویر اور بیل بوٹوں سے آراستہ ہے جو پلاسٹر ہیں بنائے گئے تھے۔ چند ہندی طرز کی رنگین شکلیں بنی ہوئی ہیں۔ اوپر کے ہال میں جنوبی مغربی کونے میں دیوار پر دو تصاویر ہیں جن میں ایک امیر ہے اور ایک بیگم۔ یہ کون ہو سکتے ہیں؟ مغلوں کی فتحیابی کے زمانے میں باز بہادر اور روپ متی کے عشقیہ افسانے لوگوں کے ذہن میں بسے ہوئے تھے۔ کیا یہ تصاویر باز بہادر اور روپ متی کی ہیں؟ مرد کی تصویر میں سر نہایت چابکدستی سے بنایا گیا ہے اور تصویر کسی ماہر مصور کا عمل معلوم ہوتی ہے۔ عورت کی شبیہ میں جو رنگ بھرا گیا تھا وہ افسوس ہے کہ اڑ گیا لیکن چہرے کے خدوخال زیورات اور سر ابھی نظر آتے ہیں۔

اگر میدنی رائے کا عرف گدا شاہ ثابت ہو جائے جیسا کہ تاریخ کے

(باقی صفحہ ۸۴) عرف گدا شاہ تھا اور یہ ہال اس کے نام سے منسوب ہے۔ آخر الذکر خیال کے مطابق بھی اس لفظ "دکان" کا استعمال دور از کار ہے۔

باب میں اندازہ کیا گیا ہی تو ممکن ہی کہ یہ تصویریں میدنی رائے اور اُس کی زوجہ کی ہوں ۔

"ساگر تلاؤ"

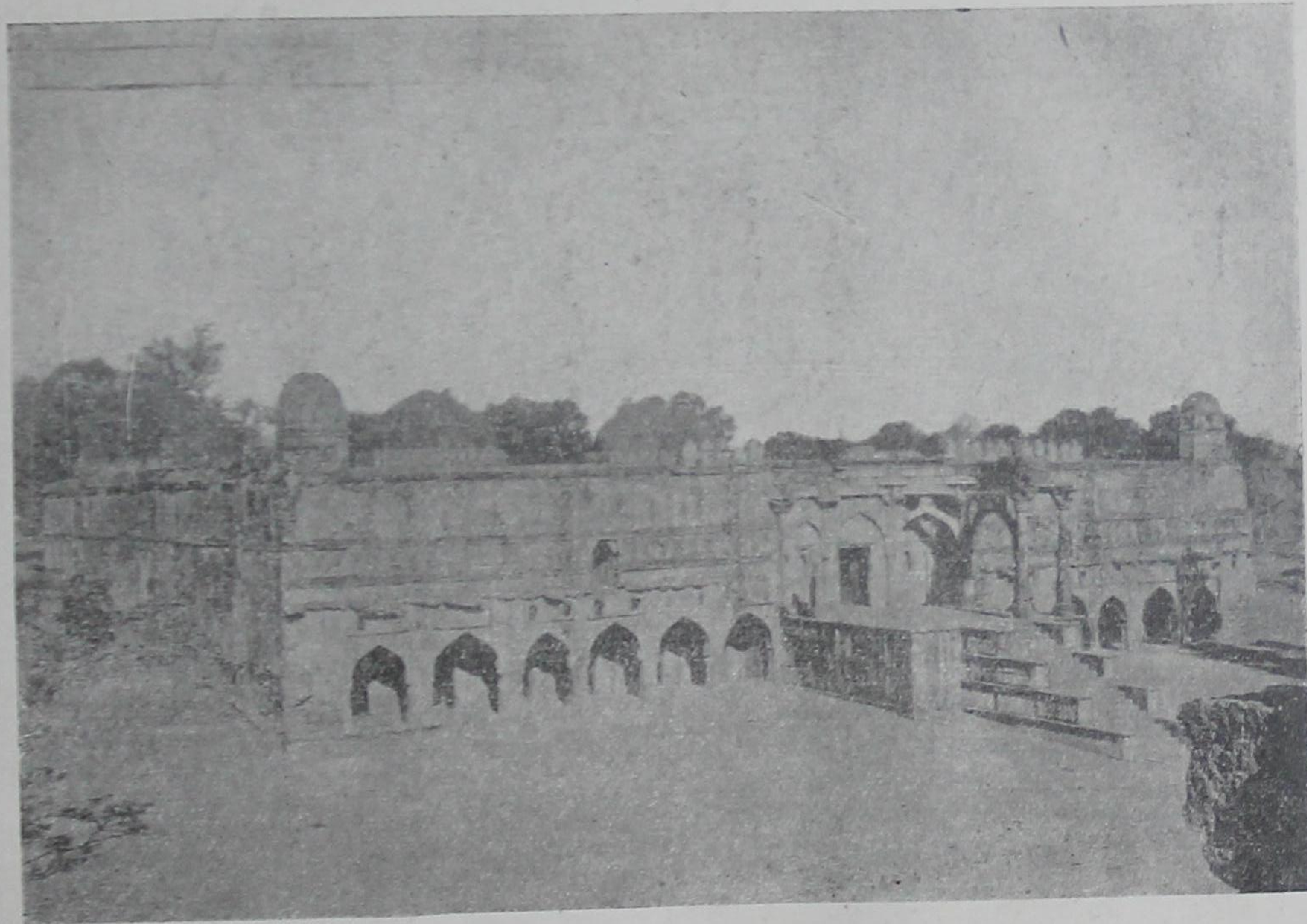
ساگر تلاؤ میں صاف ستھرا پانی دور تک پھیلا ہوا ہی۔ اس کے چاروں طرف بلند درخت ہیں۔ یہ مانڈو پہاڑی کے بالکل بیچ میں واقع ہی۔ اس کا رقبہ ۹۰۰ بیگھے میں ہی۔ گرمیوں میں دوسرے تالاب خشک ہو جاتے ہیں لیکن اس میں پورے سال بھر پانی رہتا ہی۔

تالاب کے پاس جنوب میں ایک پہاڑی ہی اور اس کے شمال و مغرب کی جانب ڈھالو زمین ہی جہاں سے برسات میں پانی آتا ہی۔ اصلی پشتہ اب اس سڑک نے لے لیا ہی جو تالاب کے مشرقی جانب ہی۔

تالاب کے مشرق میں قدیم عمارتوں کا ایک خوب صورت مجموعہ ہی جس کا بیان آگے آتا ہی۔ پشتے کے کنارے ایک پڑاؤ ہی اور کرسمس میں اکثر یورپین مہمان مہاراجا دھار کی میزبانی کا لطف اس خوب صورت اور رومانی ماحول میں اٹھاتے ہیں۔ جاڑے میں بطخیں کثرت سے اس تالاب میں آتی ہیں جو اس مقام کی دل کشی میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ مہاراجا نے درندوں کے شکار کے لیے گھنی وادیوں میں مچان بنوا دیے ہیں جہاں سے تیندوے کا شکار معمولی بات ہی اور خوش نصیبوں کو اکثر شیر بھی مل جاتا ہی۔

ملک مغیث کی مسجد

یہ ساگر تلاؤ کے مشرق میں واقع ہی اور اس کتبے کے بموجب جو دروازے



مسجد ملک مغیث

پرکندہ ہی اس کو ملک مغیث پدر محمد خلجی نے ۱۴۳۲ء میں تعمیر کیا۔ طرزِ تعمیر مخلوط ہی نیم ہندو نیم مسلم۔ عمارت کا بیرونی رُخ اسلامی طرز کا آئینہ بردار ہی۔ ایک سرسری نظر میں کرسی کے محراب دار در، اگلے رُخ کے شمال مشرق و جنوب مشرق کے مینار اور چھت کے گنبد صاف صاف پتا دیتے ہیں کہ یہ اسلامی عمارت ہی۔

مسجد کا خاص دروازہ مشرق کی جانب ہی اور سیاح سب سے پیشتر ایک برساتی دیکھے گا جو تقریباً ۹ فٹ زمین سے بلند ہی لیکن اس میں ۲۰ کشادہ سیڑھیاں ہیں۔ زینے کے ہر ایک جانب مسجد کی کرسی میں حجرے بنائے گئے ہیں جن میں مسجد کا عملہ اور زائرین قیام کرتے تھے۔ ہر طرف چھوٹے کمرے ہیں اور اس کے آگے ایک محراب دار نہایت خوب صورت غلام گردش ہی محرابوں کے اوپر کی دیوار پر پلاسٹر ہی اور سرخ رنگ داخلی دیوار کی سرخ دھاریوں کی مناسبت سے استعمال کیا گیا ہی۔ اگلے رُخ کے کونوں میں چھوٹے چھوٹے مینارے مقبرۂ ہوشنگ کے میناروں سے شکل میں بہتر نہیں ہیں اور بعد الذکر کی طرح بھدّے محسوس ہوتے ہیں۔

برساتی طول و عرض میں ۲۴ فٹ × ۲۳ فٹ ۸ انچ ہی۔ اس پر ایک گنبد تھا جو گر گیا ہی۔ ستون جن پر گنبد قائم ہیں، ان کی کندہ کاری ہندو طرز کی ہی اور ممکن ہی کہ اس مذہب کی کسی قدیم عمارت کے ہوں۔ برساتی کے در میں ستون اور سر دل دیے ہیں لیکن گنبد کی حلقے دار گھر کے لیے محرابیں کونوں پر آڑی بنائی گئی ہیں جن سے برساتی کا مربع نقشہ ہشت پہلو بن گیا ہی۔ یہ محرابیں ڈاٹوں کا کام کرتی ہیں۔ ترتیب کچھ غیر مناسب سی ہی کیونکہ محراب کے سامنے ایک ستون کی موجودگی کچھ موزوں نہیں معلوم ہوتی۔ دوسری نامناسبت

یہ ہے کہ وہ ستون جن پر ہشت پہل عمارت کی محرابیں قائم ہیں ان کا درمیانی فاصلہ یکساں نہیں ہے۔ محرابیں جو خاص مقامات کے سامنے ہیں وہ بہ نسبت ان محرابوں کے جو آڑی بنائی گئی ہیں زیادہ کشادہ ہیں۔

برساتی سے گزرنے کے بعد ایک تنگ دالان ہے جس کا طول وعرض ۱۲۳ فٹ ۶ انچ اور ۵ فٹ ۱۰ انچ ہیں۔ یہ مسجد کے صحن کا مشرقی حصہ ہے صحن میں اسی قسم کے دالان شمال وجنوب کی جانب ہیں لیکن وہ جو قبلے کی طرف ہے نہایت کشادہ (۱۲۳ فٹ ۹ انچ × ۴۲ فٹ) ہے اور چار بغلی راستوں میں منقسم ہے۔ ان کی گہرائی یکساں نہیں ہے۔ محراب کے بعد دوسرا ۸ فٹ ۵ انچ اور باقی سب محض ۵ فٹ ۱۵ انچ ہیں۔

مغربی دالان کی چھت تین گنبدوں اور متعدد درجات پر مشتمل ہے جو ہندو طرز کے ستارہ نما یا مسطح بنے ہیں۔ ان ستارہ نما درجات کے پتھروں پر نہایت خوشنمائی سے کندہ کاری کی گئی ہے وہ ستون جن پر چھت قائم ہے بلند ہیں لیکن کچھ پتلے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی سبب سے معمار نے ان کو ایک دوسرے سے نزدیک رکھا ہے۔ سردل جو ستونوں پر ہیں وہ چھت کا اور خصوصاً گنبد کا وزن برداشت نہیں کر سکے اور اکثر جگہ گر گئے ہیں۔

ان تین گنبدوں میں ایک محراب کے سامنے ہے اور دو دالان کے شمالی وجنوبی سروں پر ہیں۔ ان کے نیچے ہال کا نقشہ مربع ہے لیکن سر ستونوں پر چاروں کونوں کے آڑے سردلوں کی وجہ سے ہشت پہلو بن گیا ہے۔ سردل کے نیچے معماروں نے دروں پر نقلی محرابیں بنائی ہیں جو محض آرائشی ہیں اور گنبدوں کا وزن نہیں برداشت کر سکتی ہیں۔ برساتی کے گنبد کی ہشت پہل کرسی کے پہلوؤں کی طرح ان تینوں گنبدوں کی ہشت پہل کرسیوں کے پہلو یکساں

تینوں دوسرے گنبد اس سبب سے اب تک قائم ہیں کہ دالان کی چھت ان کو چاروں طرف سے سنبھالے ہے۔ گنبد کسی قدر چپٹے ہیں لیکن عہدِ تغلق کے ان گنبدوں سے ملتے جلتے ہیں جو دہلی میں ہیں۔

مغربی دیوار میں محراب کے علاوہ ۱۳ طاق ہیں۔ سات محراب کے داہنی جانب اور چھ بائیں جانب۔ ستونوں اور طاقوں کے سر محراب پر نہایت نازک کندہ کاری کی گئی ہے اور خود محرابیں نیلے چوکوں اور نہایت نفیس پھول پتیوں سے آراستہ ہیں۔ صحن سے مغربی دالان کا اگلا رُخ کچھ پست ہی نہیں بلکہ بے روح نظر آتا ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہندو معماروں نے اس وقت تک اسلامی فنِ تعمیر کے اصولوں پر پورا عبور حاصل نہیں کیا تھا اور جب کبھی وہ بغیر کسی نگرانی کے کچھ بناتے تھے تو اسی قسم کے نمونے پیش کرتے تھے۔

"کاروان سرائے"

ایک بڑی سرا جو ظاہرا مسجد سے ملحق تھی اس کے بالکل سامنے ہے اور غالباً اسی زمانے میں تعمیر ہوئی تھی۔

اس کا وسیع صحن طول و عرض میں ۲۲۵ × ۲۱۵ فٹ ہے اس کے چاروں طرف دوہرے دالان سلسلے وار بنے ہیں اور ہر ایک سرے پر پہلو میں کمرے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمرے سامان اور قیمتی اشیاء رکھنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے اور دالان میں خریداروں سے ملاقات کی جاتی اور اس میں لوگ سوتے بھی تھے۔ دالان کی چھت محرابدار ہے۔

ان سراؤں کا نقشہ یورپ کی عہدِ وسطیٰ کی سراؤں سے بہت ملتا جلتا ہے لیکن ہندستان میں گرم آب و ہوا کی وجہ سے عمارت میں ہر ایک جانب محراب دار در ہیں۔ یورپ میں یہ بند کر دیے جاتے ہیں اور ان میں چوکھٹ بازو اور طرح طرح کی کھڑکیاں لگائی جاتی ہیں۔ ہندستان میں سرا کے ضروری ملحقات مسجد یا مندر بعض اوقات دونوں اور کنواں یا تالاب ہوتے ہیں۔ مشرق میں سراؤں کی چہاردیواری بلند اور مستحکم ہوتی ہے اور وہ سوداگروں اور ان کے مال و اسباب کو ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے چھوٹے چھوٹے قلعوں کا کام کرتی ہیں۔

"دائی کی چھوٹی بہن کا محل"

کارواں سرائے کے جنوب میں بہت سی قدیم عمارتیں ہیں جن کا نام دائی کا محل، دائی کی چھوٹی بہن کا محل وغیرہ ہیں۔ ان کا طرزِ تعمیر نہایت واضح ہے اور مانڈو کی قدیم عمارتوں کی تاریخ میں یہ تیسرے دَور کی نشانی ہیں۔ اس زمانے میں مقامی معماروں نے اسلامی فنِ تعمیر کے اصول و مقاصد پر عبور حاصل کر لیا تھا اور گنبدوں اور محرابوں میں وہ غلطیاں نہیں ملتیں جو ملک مغیث کی مسجد میں نظر آئیں۔ انھوں نے خود اپنی صنّاعی سے چند خصوصیات بالخصوص منبّت کاری بڑی خوش اسلوبی سے جدید طرز میں شامل کر لی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارتیں سولھویں صدی میں ملک مغیث کی مسجد کے تقریباً ایک صدی بعد تعمیر کی گئیں۔

کارواں سرائے سے روانہ ہو کر جنوب میں پگڈنڈی پر ۱۰۰ قدم چلنے کے بعد پہلی عمارت آتی ہے جس کا نام "دائی کی چھوٹی بہن کا محل" ہے اس کا نام گو محل ہے

لیکن یہ کسی خاتون کا مقبرہ ہی۔ مسلمان جن مکانات میں رہتے تھے مرنے کے بعد اکثر اسی میں دفن ہوئے۔ مقبرے کا مقام نہایت رفیع ہی کیونکہ دوہرے چبوترے پر بنایا گیا ہی اور نیچے کا حصّہ (۴۲ فٹ × ۴۲ فٹ ۶ انچ) زمین سے ۱۳ فٹ بلند ہی بالائی حصّہ پہلے سے ۲ فٹ ۲ انچ زیادہ بلند ہی اور عرض و طول میں ۳۵ فٹ مربّع ہی۔

مقبرے کا نقشہ اندر اور باہر سے ہشت پہلو ہی اور اس کے اوپر ایک خوشنما گنبد نیلے چوکوں سے آراستہ ہی جس کے محض نشانات رہ گئے ہیں۔ گنبد پر چوکے لگانے کے لیے کیلیں اور پلاسٹر استعمال کیے گئے ہیں۔ مقبرہ سرخ اینٹ، مسالے وغیرہ سے تعمیر ہوا ہی۔ ہر چہار سمت میں محراب دار در ہیں باقی چار پہلوؤں پر محرابوں کے خاکے ہیں۔ مقبرے کے بیرونی رخ پر دھاریاں ہیں جن سے دیوار کی سطح کئی حصّوں میں تقسیم ہوگئی ہی اور ایسی معلوم ہوتی ہی جیسے چوبی عمارت ہو۔ یہ خصوصیت ہندو صنّاعی کا اظہار کرتی ہی اور مانڈو کی ابتدائی عمارتوں میں نظر نہیں آتی۔

مقبرے کے پہلو اندر سے طول میں ۹ فٹ ۱۲ انچ ہی اور ان کا فاصلہ ۲۳ فٹ ۲ انچ ہی جو گنبد کا قطر ہی۔ گنبد کے گھیرے کے نیچے مقبرے کا داخلی نقشہ سولہ پہلوؤں پر مشتمل ہی۔ یہ شکل ڈاٹیں لگا کر پیدا کی گئی ہی۔ کندہ کاری کا استعمال آرایش کے لیے کہیں کہیں کیا گیا ہی لیکن جہاں بھی ہی خوش مذاقی کا پتا دیتا ہی۔

مقبرے کے مغرب میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کی مغربی دیوار اب بھی قائم ہی

"ساگری تالاب اور باغ"

آخر الذکر قدیم عمارت کے جنوب میں ایک خوب صورت باغ اور

شہ نشین کے کھنڈر ہیں۔ خوشنما آبشار اور حوض کے آثار باقی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باغ مغلوں نے لگایا تھا کیونکہ نہروں اور فواروں کا نقشہ اور شہ نشین کے آرایشی کام سے ان کے ذوق کا اظہار ہوتا ہے۔

دائی کا محل

آگے جنوب کی جانب دائی کا محل آتا ہے۔ یہ نہایت رفیع الشان عمارت ہے جس کی کرسی ۱۶ فٹ بلند ہے۔ کرسی کے مغربی جانب کچھ کمرے ہیں جن میں محراب دار در ہیں یہ مجاورین کے لیے بنائے گئے ہیں۔ شمال مشرق اور جنوب مشرق میں گول برجوں کے آثار ملتے ہیں جن کے اوپر شہ نشین بنائے گئے ہیں۔

کرسی کے اوپر جو چبوترہ ہے اس کا طول و عرض ۹۲ فٹ ۴ انچ × ۹۰ فٹ ۸ انچ ہے۔ اس کے علاوہ مقبرہ (جو وسط میں بنا ہے) اس کے مغرب میں ایک خوب صورت مسجد ہے۔ اگلا رخ اور مسجد کی چھت کا ایک حصہ گر گیا ہے لیکن قبلے کی دیوار قائم ہے اور اس کے طاقوں پر عمدہ کندہ کاری کی گئی ہے۔ مسجد میں دوہرا دالان ہے (۱۶ فٹ ۴ انچ × ۲۸ فٹ ۳ انچ) چھت اصل میں ۱۰ محرابوں پر قائم تھی جن میں سے ۷ ذرا چپٹی تھیں اس سبب سے چھت کی دبازت میں چھپ گئیں اور تین اوپر نکلی ہوئی ہیں۔ بعد الذکر کی دو محرابیں اب بھی قائم ہیں اور اندر کی جانب خوب صورت چوکوں سے آراستہ ہیں۔ مسجد کے شمالی و جنوبی سروں پر نہایت خوب صورت کھڑکیاں دیواروں میں بنی ہیں۔ ان میں ہندو طرز کا جنگلا اور دیوارگیریاں ہاتھی کے بڑے دانتوں کی شکل کی ہیں۔ کھڑکیوں کی چھت نیم مخروطی ہے اور اس میں چھجے لگے ہیں۔

خاص مقبرے کا نقشہ مربع ہے اور باہر سے ۳۷ فٹ ۶ انچ ہر طرف ہے اور اندر سے ۲۶ فٹ ۶ انچ۔ مقبرے کا گنبد گاؤ دم ہے جیسا کہ اس کے ہم عصر دکن کی عمارتوں میں ہے۔ اس میں اوپر منڈیر اور وسط ستون کے چاروں طرف گلدستے ہیں۔ مانڈو کے گنبد کی یہ مخصوص آرائش گولکنڈہ کے قطب شاہی گنبدوں کی عام خصوصیت ہے۔ فنِ تعمیر کی خصوصیتوں کی یہ مشابہت اس سبب سے ہے کہ سولھویں صدی میں مالوہ اور دکن میں بہت میل جول تھا۔

"صدائے بازگشت کا مقام"

اگر سیاح ساگر تلاؤ کے پشتے کی جانب جنوب میں جائے تو وہ درختوں کے ایک خوب صورت جھنڈ کے پاس سے گزرے گا جہاں "دائی کے محل" کی جانب منہ کر کے گانا گائے تو نہایت عمدہ صدائے بازگشت پیدا ہوگی۔ قدیم زمانے میں لوگ مانڈو پہاڑی کی چڑھائی سے تھک کر جب اس جھنڈ کے نیچے آرام کرتے ہوں گے اور تھکن کے عالم میں کوئی کبھی کچھ الاپنے لگتا ہوگا تو صدائے بازگشت سے یہ سمجھ کر خوف زدہ ہوتے ہوں گے کہ سنسان جنگل میں کوئی صحرائی دیوتا ان کی نقل کر رہا ہے۔

آگے چل کر سڑک جنوب میں بہت سے ٹیلوں اور وادیوں سے گزرتی ہے جو گھنے جنگلوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اس گھنے جنگل میں یہاں وہاں بھیلوں کی جھونپڑیاں ہیں اور ان کے بچے گایوں کو چراتے پھرتے ہیں اور قدیم تیر کمان سے تیر اندازی کی مشق کرتے ہوتے ہیں۔ ساگر تلاؤ کے جنوب میں ٹیلے پر ایک خوب صورت عمارت ہے جس کا نام جالی محل (نمبر ۱۲) ہے۔

جالی محل (نمبر ۱)

یہ درحقیقت کسی امیر کا مقبرہ ہے جس میں چار قبریں ہیں۔ یہ اندر سے ۲۰ فٹ ، ۷ انچ مربع ہے اور باہر سے ۳۳ فٹ ہے۔ ہال کے ہر ایک جانب تین محراب دار در ہیں۔ ان میں سے ۱۱ دسوائے درمیانی در کے جو جنوب کی جانب ہے، جالی دار ہیں۔ جالیوں پر اندر اور باہر دونوں جانب نہایت عمدہ نقش ہیں۔ یہ کام اسلامی طرز کے ہندی نمونے کا ہے۔ جالی محل کا نام ان جالیوں کی وجہ سے رکھا گیا ہے لیکن حقیقتاً جالی نہیں ہے کیونکہ یہ مشبک نہیں ہیں مقبرہ سنگِ سرخ سے تعمیر ہوا ہے اور اس پر ایک گنبد ہے جو دائرے کی تین چوتھائی شکل کا ہے۔

اس پہاڑی کے نیچے جس پر جالی محل قائم ہے سڑک بجانب مشرق مڑتی ہے اور اس طرف کچھ دور اور جانے کے بعد پھر جنوب کی جانب مڑجاتی اور ایک احاطے میں سے گزرتی ہے جو اس محل و تفریح گاہ کے چاروں طرف تھا جس کو باز بہادر اور اس کی مشہور محبوبہ روپ متی کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔

ریوا کنڈ

ان خوب صورت قدیم عمارتوں کے پاس پہنچنے پر پہلی چیز جس کی جانب نظر اٹھتی ہے ریوا کنڈ ہے جس کے پھیلے ہوئے صاف شفاف آئینے سے پانی میں کنارے کے گھنے درختوں کا سایہ نظر آتا ہے۔ کنڈ کے کنارے پختہ ہیں اور سیڑھیاں سطحِ آب تک جاتی ہیں جن پر سے گانو کی عورتوں کی قطاریں چڑھتی اترتی نظر آئیں گی کیونکہ ہندو اس تالاب کے پانی کو پاک

سمجھتے ہیں لوگ دُور دُور سے کنڈ میں نہانے کے لیے آتے ہیں اور اس کے
پاک پانی کو لے جاتے ہیں۔ ناظرین کو اس کنڈ کی تعمیر کا رومانی افسانہ یاد ہوگا۔
یہاں پہاڑی جنوب کی جانب ڈھالو ہے اور یہ ممکن ہے کہ زمانۂ قدیم سے یہاں
قدرتی چشمہ موجود ہو جس کی قدیمی روایات باز بہادر اور روپ متی سے اس وقت
منسوب ہوگئیں جب انھوں نے کنڈ کو وسیع اور درست کیا۔

تالاب کے شمالی کونے میں پشتہ اب تقریباً ۲۷ فٹ کشادہ ہے
لیکن وہاں پرانی اینٹوں کی دیوار کے آثار پائے جاتے ہیں جو ظاہرا پشتے
کو زیادہ مستحکم کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ کنڈ کا طول اس سرے پر (شمال)
۲۳۵ فٹ ۶ انچ ہے لیکن اس کے مشرقی و مغربی کنارے بہت زیادہ لمبے
ہیں۔ شمالی سرے پر ایک پانی کی ڈھیکلی تھی جو ملحقہ محل کی ضروریات کو
پورا کرتی تھی۔ محل کے خاص دروازے کے سامنے قدیم نالی کے آثار نظر
آتے ہیں۔

کنڈ کے شمالی مغربی جانب کچھ وسیع کمرے ہیں۔ یہ اس عشرت کدہ کی
یادگار ہیں جو ایک زمانے میں وہاں تھا۔ ان کا نقشہ اور فنِ تعمیر بتاتا ہے کہ یہ
مختلف زمانوں میں تعمیر ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں دوہرا ہال تھا
(۷۷ فٹ ۷ انچ × ۳۱ فٹ) جس میں پانچ محراب دار در پانی کی جانب ہیں
اور ایک چبوترہ ان کے سامنے ہے۔ یہ دوہرا ہال اب بھی قائم ہے اس کے
دروں کی محرابوں کا درمیانی فاصلہ ۱۰ فٹ ۱۰ انچ ہے قدیم زمانے میں جب بادشاہ
ملحقہ محل میں قیام پزیر ہوتے تھے تو ظاہرا ان کے ہمراہیوں کے قیام کے
لیے جگہ درکار ہوتی تھی اس لیے اصل ہال کے سامنے ایک دوسرا ہال مع
دو[۲] درجوں کے (۴۲ فٹ × ۳۰ فٹ ۸ انچ) بنایا گیا لیکن اول الذکر کے

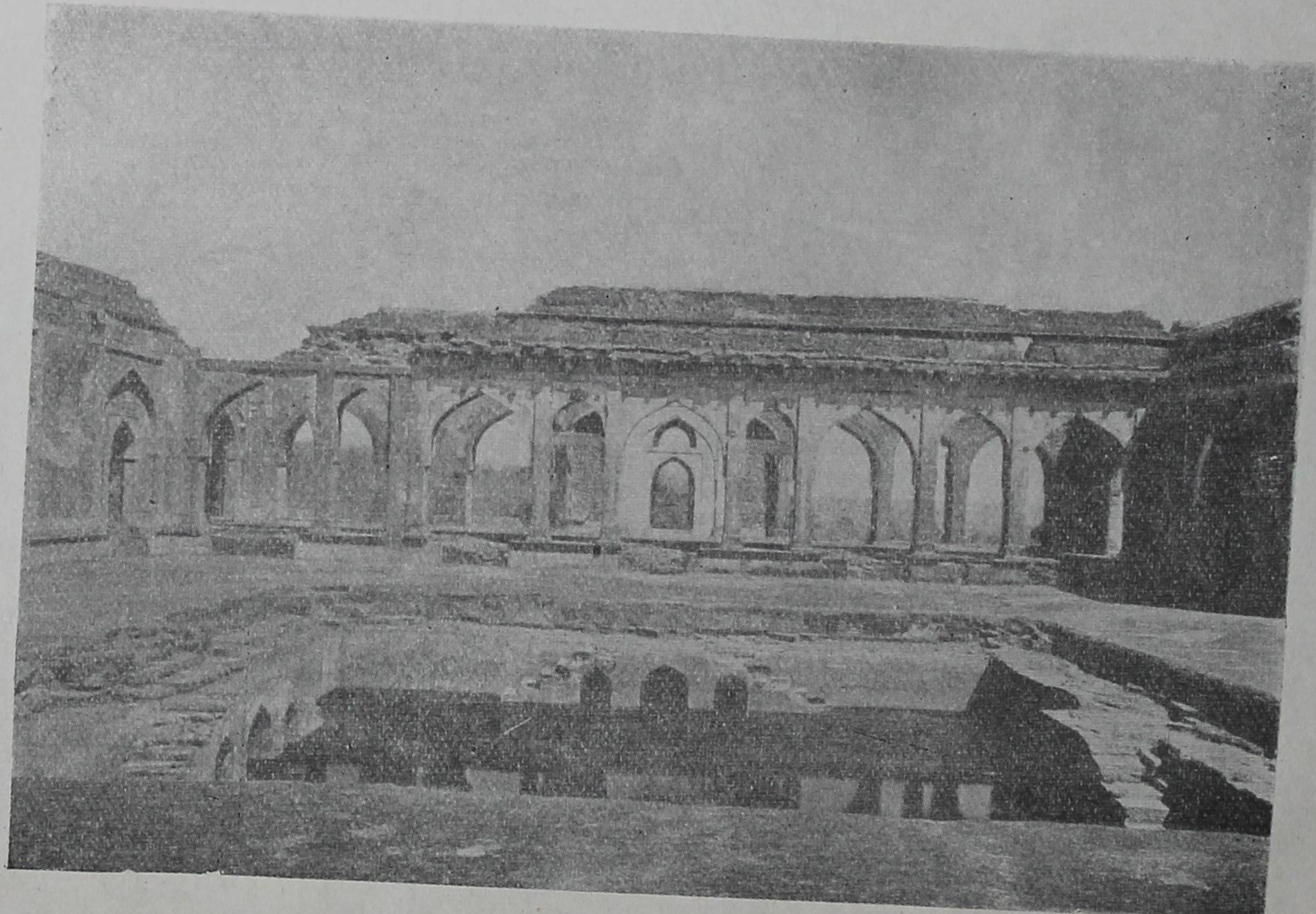
اگلے رُخ کی تین محرابیں بعد الذکر کی وجہ سے چھپ گئیں ۔ اصل ہال کے بائیں دو دروں کے سامنے ایک حوض کے آثار نظر آتے ہیں ۔ بعد کی عمارت کے ستون مثمن ہیں ۔ ستونوں کی یہ شکل مانڈو میں غالباً اول مرتبہ اختیار کی گئی ۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ سنگ تراش کو اس شکل سے جو انس تھا اس کا پتا اصل ہال کی سنگین مثمن چولوں سے پتا چلتا ہے جو دروں میں اس سبب سے لگائے گئے ہیں تاکہ دونوں ہال کے درمیان دروازے لگائے جا سکیں ۔

اضافہ کیے ہوئے ہال کی محرابیں کچھ زیادہ کشادہ نظر آتی ہیں ۔ ان کا درمیانی فاصلہ ۱۳ فٹ ہے اور بلندی کم ہو جانے کی وجہ سے وہ کچھ پست نظر آتی ہیں ۔

"باز بہادر کا محل"

یہ محل ریوا کنڈ کے مشرق میں پہاڑی کی ڈھال پر تعمیر ہوا ہے جو بہت خوب صورت جگہ ہے ۔ شمال میں کنڈ کے پشتے سے محل کے اول دروازے تک چالیس کشادہ سیڑھیاں ہیں اور آسانی کے لیے دس چبوترے ہیں ۔ یہاں دروازے کی محراب پر ایک فارسی کتبہ کندہ ہے جس سے اس واقعہ کا اظہار ہوتا ہے کہ محل ناصر الدین نے ۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) میں تعمیر کیا تھا ۔ باز بہادر کو یہ پسند آگیا کیونکہ وہ ریوا کنڈ کے نہایت نزدیک تھا جہاں اس کی حسین محبوبہ روپ متی غالباً اشنان کے لیے آتی ہوگی اس نے دورانِ اقامت میں اس محل میں بہت سے اضافے بھی کیے اسی سبب سے باوجود اس کتبے کے اس عمارت کو باز بہادر کے نام سے منسوب کرنا غلطی نہ ہوگی ۔

اس محل کی ڈیوڑھی بھی ہے اور اس میں ہر سرے پر ایک محراب دار درہے



باز بہادر کا محل

راستہ ۱۱ فٹ چوڑا ہی اور محراب دار چھت ہی۔ راستے کے ہر ایک جانب محافظوں کے لیے کمرے ہیں۔ ان کمروں کا نقشہ مستطیل اور ان کی چھت مختلف محرابوں پر مشتمل ہی جن کے متعدد رُخ ہیں۔ داخلی محراب سے باہر آنے پر راستہ مشرق کی طرف جاتا ہی جہاں ایک برساتی ہی جس میں سے ہو کر محل کے بیرونی صحن کو جاتے ہیں۔ عمارت کے بیرونی حصّے پر پلاسٹر ہی۔ دو دروازے سرخ اینٹ کے ہیں۔ محل میں داخل ہونے کے لیے مختلف مقامات پر دروازے ہیں۔ اس داخلی صحن کے شمالی سرے پر زینے ہیں جو تہ خانے کو جاتے ہیں جن میں محراب دار چھتوں کے کمروں کا ایک سلسلہ ہی۔ درمیانی کمرے کا نقشہ مستطیل ہی اور اس کا طول و عرض ۴۶ فٹ ۶ انچ × ۱۶ فٹ ۲ انچ ہی۔ اس کے سامنے ایک مثمّن شہ نشین ہی جو عمارت کے سامنے نکلی ہوئی ہی اور سامنے کی دیوار کی یکساں سطح کو دیکھتے ہوئے بھلی معلوم ہوتی ہی۔ تہ خانے کے بعد نشیب ہی جہاں شاہی باغات لگائے گئے تھے جس کے نشانات آج بھی نمودار ہیں۔

محل کے خاص درجوں میں داخل ہونے کے لیے صحن کی جانب واپس آنا چاہیے اور دوسرے دروازے سے جانا چاہیے جہاں سے راستہ پہلے مشرق کی جانب مڑتا ہی بعد ازاں شمال کی طرف اور آخر کار پھر مشرق کی طرف۔ یہ پُرپیچ و خم ترتیب اس لیے رکھی گئی تھی تاکہ لوگوں کی نظریں محل والوں پر نہ پڑیں۔

راستے کے آگے ایک وسیع صحن ہی جس کے چاروں طرف ہال اور کمرے ہیں اور وسط میں ایک خوب صورت حوض[1] ہی۔ صحن کے طول و عرض

---

[1] ریوا کنڈ سے پانی حوض میں ایک نالی کے ذریعے سے آتا ہی جس کے نشانات محل کے بیرونی دروازے کے سامنے اور خارجی صحن کے شمال مغرب کی دیواروں کے پاس نظر آتے ہیں۔

۸۹ فٹ ۵ انچ × ۸۴ فٹ ہیں۔ حوض ہر جانب سے ۵۰ فٹ ہے۔ صحن کے شمالی جانب ایک دالان اور اس کے ہر سرے پر ایک کمرہ ہے (۱۷ فٹ ۸ انچ مربع) اور ایک مثمن شہ نشین ہے جو اس کے شمالی جانب نکلی ہوئی ہے۔ دالان میں صحن کی جانب نو محراب دار در ہیں اور چونکہ ان دروں کی چوڑان مختلف ہے اس لیے محرابوں کے درمیانی فاصلہ کا تنوع عمارت کے اگلے رُخ میں دل کشی پیدا کر دیتا ہے۔ شہ نشین سے باغات دکھائی دیتے ہیں کیونکہ یہ محل کے تہ خانے سے نیچے درجے پر تھے۔ اس شہ نشین کی مثمن شکل سیّاح کو دہلی یا آگرہ کے مثمن برج کی یاد دلاتی ہے جہاں کے خوب صورت نقش و نگار اور نازک کندہ کاری اسے پرستان بنا دیتی ہے لیکن مانڈو کے سادے شہ نشین میں وہ سحر کاریاں نہیں ملتیں۔ شہ نشین کی محرابیں کھلی ہوئی ہیں لیکن جب یہاں بیگمات ہوتی تھیں تو پردے ڈال دیے جاتے تھے۔ شہ نشین ۱۵ فٹ ہے۔

دالان اور کمروں کی چھتیں مشرقی و مغربی سروں پر گر گئی ہیں۔ بعد الذکر میں غالباً بارہ دریاں تھیں جن کی گنبد نما چھتیں تھیں جیسی کہ محل کے دوسری جانب نظر آتی ہیں۔

صحن کے مشرقی طرف ہر ایک کونے میں ایک مربّع کمرہ ہے (۱۵ فٹ مربّع) اور ان کے درمیان میں کھلی ہوئی جگہ ہے (۱۵ فٹ ۳ انچ مربّع) جس کی اہمیت کچھ صاف سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ یقینی امر ہے کہ شروع ہی سے کھلا ہوا تھا ورنہ کانس اور کنارے کے دونوں کمروں کے ستونوں کی دھاریاں اگلے رُخ پر کھلی ہوئی جگہ کی جانب نہ بنائی جاتیں۔

صحن کے مغربی جانب برابر میں محل کا دروازہ ہے اس لیے یہ رائے

قائم کی جا سکتی ہی کہ اُس طرف دروازے کے لیے یہ کھلی ہوئی جگہ بچا لی گئی تھی۔ لیکن محل کے احاطے کی پشت پر جو پہاڑی ہی وہ مشرق کی جانب بہت ڈھالو ہی اور اس جانب دروازے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

مشرقی جانب کے مربّع کمروں کے برابر مغرب میں کمرے ہیں جو دروازے کے دونوں طرف بنائے گئے ہیں اور ۱۵ فٹ ۳ انچ مربّع ہیں۔

صحن کے جنوبی طرف کے درجات اُن درجوں کے مطابق نہیں ہیں جو شمال میں ہیں۔ اصل ہال کا طول و عرض ۴۷ فٹ ۳ انچ × ۱۸ فٹ ۶ انچ ہی یہ بھی محرابوں سے تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہی۔ ان کا درمیانی فاصلہ ۱۱ فٹ ۲ انچ ہی۔ ہال کی محراب دار چھت ہی۔ ہال کے ہر ایک سرے پر دو کمرے ہیں۔ ہر ایک ۱۴ فٹ مربّع ہی۔ ہال کی پشت پر (شمال) ایک اور کمرہ ہی جو کم کشادہ ہی (۱۲ فٹ ۴ انچ)۔ اس کی چھت چورس ہی اور دیوار کے پاس کچھ ٹیڑھے خطوط ہیں۔ ہنڈولا محل کی چھت جو گر گئی ہی اسی طرز کی تھی۔ پشت کے ہال کے ہر کنارے پر کمرے ہیں (۱۲ فٹ ۴ انچ مربّع)

اس ہال کے دَر سے سیڑھیاں دُوسرے چوک کو جاتی ہیں جو پہلے صحن سے طول و عرض میں کم ہی (۶۴ فٹ مربّع) اور ظاہرا محل کے نوکروں کے لیے مخصوص تھا۔

اس چوک کے مشرقی جانب ایک ہال ہی (طول میں ۴۷ فٹ ۲ انچ اور عرض میں ۱۸ فٹ ۱۰ انچ) جس میں تین محراب دار در ہیں۔ ہال میں بجانب جنوب تین محراب دار در ہیں لیکن یہ دو درجوں پر مشتمل ہی۔ بیرونی درجہ طول و عرض میں ۴۷ فٹ ۲ انچ × ۱۹ فٹ ۲ انچ ہی اور اندرونی درجے کا طول اتنا ہی ہی لیکن عرض میں کچھ کم ہی (۱۴ فٹ ۸ انچ) ہال کی چھت محرابوں سے

چھ حصّوں میں منقسم ہے۔ ہال کے ہر ایک کنارے پر کمرے ہیں ۱۴ فٹ ۸ انچ مربع۔

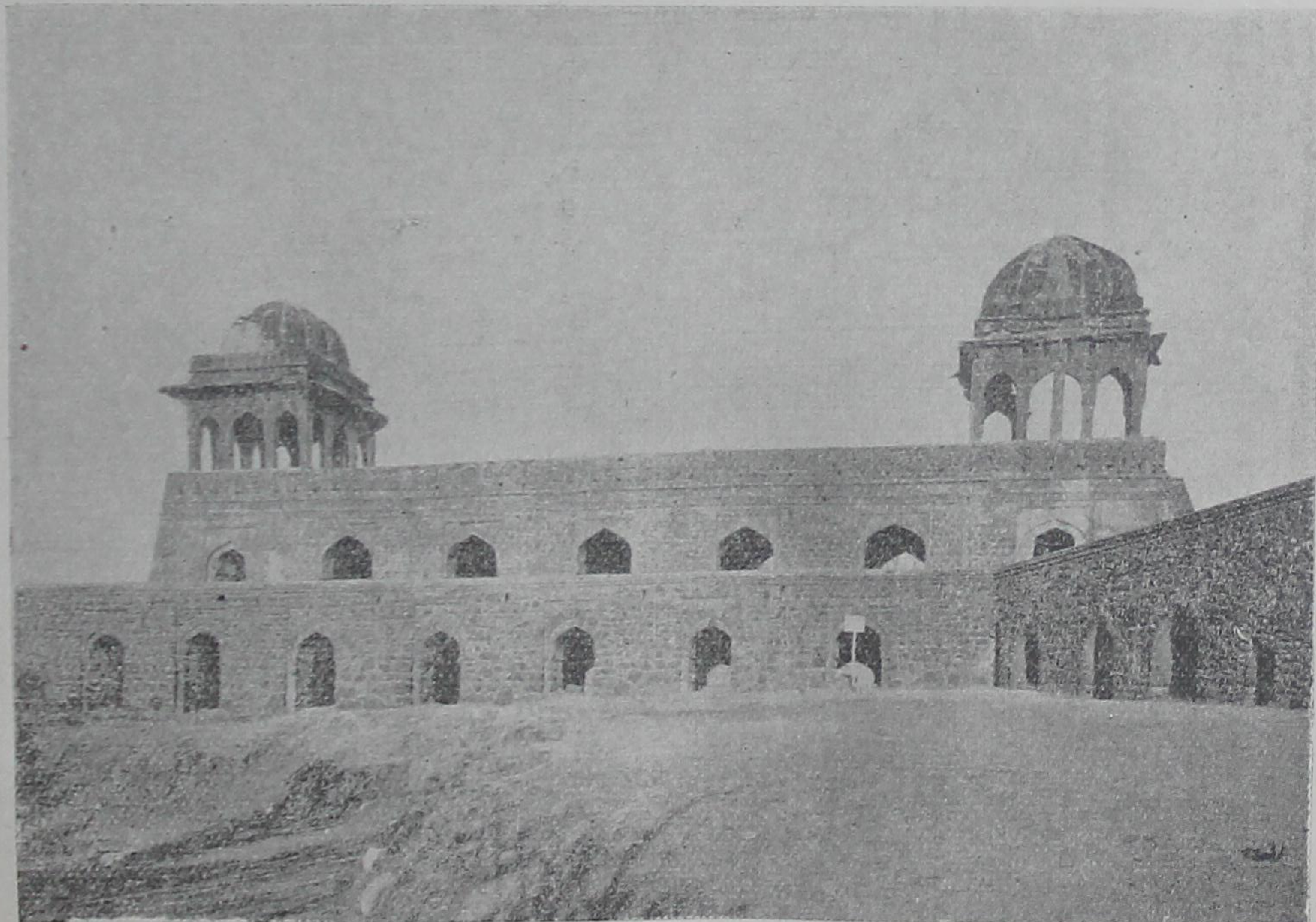
چوک کے مغربی جانب دروازے کے پاس (جو صدر میں ہے) ہر ایک سرے پر دو کمرے ہیں۔ وہ طول و عرض میں یکساں ہیں (۱۸ فٹ ۱۰ انچ × ۱۴ فٹ ۲ انچ)۔

۳۱ سیڑھیوں کا زینہ جو دیوار میں بنایا گیا ہے نو کروں کے چوک کو عمارت سے جدا کر دیتا ہے اور چبوترے تک جاتا ہے جو بہت وسیع ہے اس کے شمال مشرق و شمال مغرب کے زاویوں میں دو خوب صورت بارہ دریاں ہیں چبوترے سے پہاڑی کے دل کش مناظر نظر آتے ہیں اور خیال آتا ہے کہ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں باز بہادر موسیقی سے کیسا لطف اندوز ہوتا ہوگا۔ موسیقی وہ فن ہے جس کو تاریخ نے اس کے نام کے ساتھ ہمیشہ کے لیے منسوب کر دیا ہے۔

محل کے مقام کی دل کشی سے قطعِ نظر اس میں کسی قسم کا تعمیری شکوہ نہیں ہے اور اس کا تعلق مانڈو کی ازمنہ وسطیٰ کی یادگاروں سے ہے۔ دیوار گیریاں جن پر چھجے قائم ہیں۔ اسی طرز کے ہیں جیسے جہاز محل کے اور چونکہ ان دونوں میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو مشترک ہیں۔ اس لیے یہ ممکن ہے کہ دونوں ہم زمانہ ہوں حالانکہ جہاز محل تاریخِ تعمیر کے اعتبار سے کچھ پہلے بنا ہے۔[1]

---

[1] بارہ دری کے اندر کا نقشہ جو باز بہادر کے محل پر تعمیر ہوا ہے مثمّن ہے جیسی ملک مغیث کی مسجد کی برساتی ہے اور گو کہ قبل الذکر میں ستونوں اور گنبدوں کی شکل اور طرزِ تعمیر بہتر ہے لیکن مثمّن کی آڑی محرابوں کے سامنے ستونوں کی موجودگی سمجھ میں نہیں آتی۔



رُوپ کا محل

"روپ متی کے شہ نشین"

باز بہادر کے محل کے آگے پہاڑی بہت ڈھلواں ہے اور گورنمنٹ ریاست دھار نے قدیم عمارتوں کی حفاظت پر خاص توجہ کی ہے اور سڑک کو پہاڑی کی چوٹی تک اس قابل بنا دیا ہے کہ موٹر جا سکتا ہے لیکن پھر بھی سیاح کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ یہ راستہ پیدل طے کرے۔

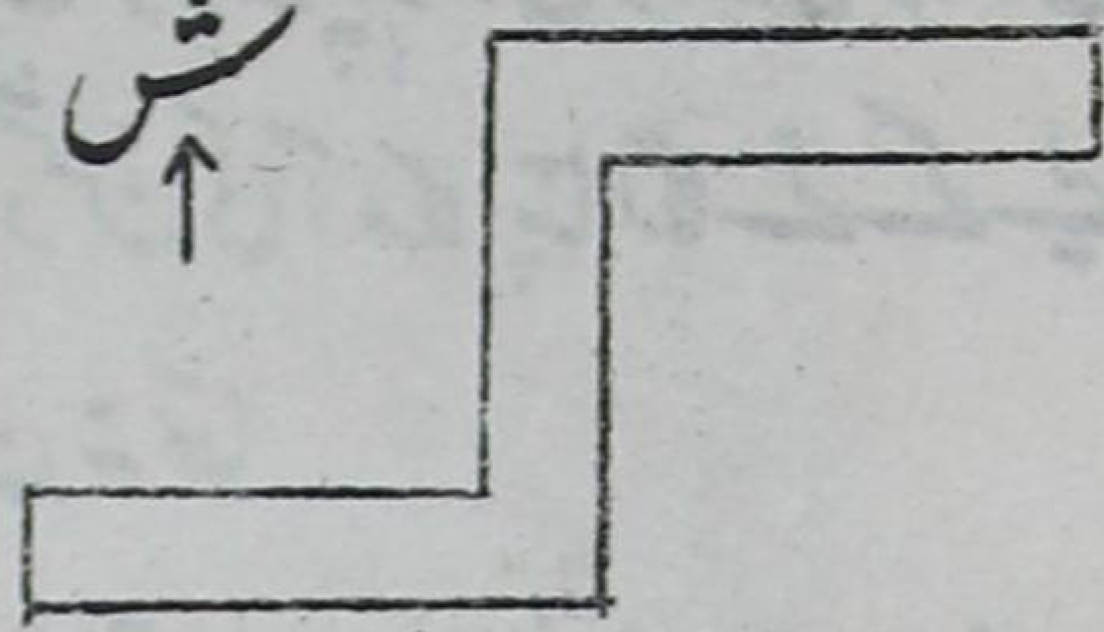
اس عمارت کی تعمیر کا اصلی مدعا نگہبانی تھا کیونکہ پہاڑی نیماڑ کی وادی کی طرف ۱۲۰۰ فٹ بلند ہے اور اس طرف کسی دشمن کی آمد کا پتا لگانے کے لیے اس سے زیادہ محفوظ و بلند مقام کا انتخاب ممکن نہ تھا

معلوم ہوتا ہے کہ تہ خانہ اور شہ نشین جو چبوترے پر بنے ہیں بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں۔ اصل عمارت ایک نیچے لیکن وسیع ایوان پر (۸۰ فٹ ×۱۹ فٹ ۱۰ انچ) مشتمل تھی۔ اس میں دو کمرے (ہر ایک تقریباً ۱۵ فٹ مربع) کناروں پر بنے ہیں جیسے ہم کو پہلی منزل میں نظر آتے ہیں۔ ہال کی دیواریں تغلقوں کی عمارتوں کی طرح اپنی نیو کی طرف ڈھلواں ہیں اور محرابیں جن پر چھت قائم ہے تناسب کے لحاظ سے زیادہ بھاری ہیں (ان کا درمیانی فاصلہ ۱۳ فٹ ۸ انچ) ہال کے ایک طرف (مشرق و مغرب) پانچ محراب دار در ہیں۔ کمرے جو کناروں پر بنے ہیں ان میں ایک در ہے۔

اس کمرے کے دروازے پر ہال کے شمالی کونے میں ایک لوحِ کتبہ دیوار میں نصب ہے۔ چونکہ حروف بہت کھرچ گئے ہیں اور لوح دراصل خالی طاق میں نصب کی گئی تھی۔ یہ طاق عمارت کے مشرقی جانب ہے۔ ہال کے اندر یہ مٹ نہیں سکتی تھی۔ یہ بات بھی ہے کہ لوح کے کنارے کے پتھر بہت

ہی بھدّے طریقے سے لگائے گئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ مقابلۃً حال میں لگے ہیں۔ کتبے کے چند الفاظ جو پڑھے جا سکتے ہیں وہ اس خانقاہ کے متعلق ہیں جس کا تعلق دھار کے کسی پیر سے ہے اور یہ ممکن ہے کہ اس عمارت نے کسی زمانے میں یہ شکل اختیار کی ہو لیکن درحقیقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت عبادت کے لیے نہیں بلکہ فوجی مقاصد کے لیے تعمیر کی گئی تھی۔

تہ خانے کا اضافہ غالباً اس وقت کیا گیا جب زیادہ محافظوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پہاڑی کی ڈھال جس پر اصل عمارت تعمیر ہوئی ہے اس کا خاکہ حاشیے کے نقشے سے سمجھ میں آتا ہے۔



تہ خانے کا درمیانی حصّہ اصل عمارت کے بالکل نیچے بنا ہے۔ اس سبب سے اوّل الذکر کی چھت چبوترے کا کام دیتی ہے (۱۶۰ فٹ ۴ انچ × ۱۶ فٹ ۶ انچ) زمین کے فرش پر تہ خانے کا یہ حصّہ ایک لمبی غلام گردش پر مشتمل ہے جس کو ان محرابوں نے جن پر قوسی چھت قائم ہے کئی حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس میں مغربی جانب آٹھ محرابیں ہیں۔

تہ خانے کی توسیع مشرق کی جانب غلام گردش کی شکل میں ہے اس میں بجانب جنوب گیارہ محرابیں ہیں۔ چھت کے سہارے کے لیے کئی چوڑی محرابیں آر پار بنائی گئی ہیں اس غلام گردش کا طول و عرض ۱۷۰ فٹ ۹ انچ × ۱۵ فٹ ۳ انچ ہے۔

تہ خانے کا نکلا ہوا حصّہ مغرب کی جانب طول میں ۱۳۶ فٹ اور عمق میں ۲۹ فٹ ۴ انچ ہے۔ اس نکلے ہوئے حصّے کے اندر ایک بہت بڑا حوض (۱۸ فٹ ۱۱ انچ طول، ۱۳ فٹ ۲ انچ، عرض ۹ فٹ ۲ انچ عمق)

بنا ہی جس میں مشرق کی طرف سے پانی بذریعے نہر آتا تھا جو بعدازاں چھت پر لایا جاتا جہاں سے برساتی پانی بہ کر نیچے حوض میں گرتا تھا۔ دریائے نربدا کی سطح سے پہاڑی کی بلندی ایک ہزار فٹ سے بھی زیادہ ہی۔ چونکہ ریوا کنڈ بھی یہاں سے فاصلے پر ہی اس لیے ان محافظین کے لیے جو یہاں تعینات ہوں حوض کی اشد ضرورت محسوس کی گئی ہوگی۔ اس حصّے میں شمال کی جانب ۱۱ محرابیں ہیں۔

اصل عمارت کی جانب واپس آتے ہوے سیاح دیکھے گا کہ اس کمرے سے جو جنوبی کنارے پر ہی سیڑھیاں شہ نشین اور اس چبوترے تک جاتی ہیں جو اوپر ہی۔ شہ نشین کا نقشہ مربّع ہی (۱۶ فٹ ۶ انچ ہر ایک جانب) لیکن ان پر نیم کری گنبد ہیں جن کے خارجی و داخلی جانب نقش ونگار بنے ہیں یہ شہ نشین روپ متی کے نام سے منسوب ہیں وہ غالباً روزانہ پوتر نربدا کے درشن کے لیے یہاں آتی ہوگی جو نیچے میدانوں میں سفید ناگ کی طرح بل کھاتا ہوا چلا جا رہا ہی۔ ستونوں کی شکل سے جو مربّع ہیں اور محرابوں کے تناسب سے اس بات کا اندازہ[1] ہوتا ہی کہ یہ شہ نشین روپ متی کے زمانے سے ایک صدی پیشتر بنائے گئے تھے۔ عمارت کا اصل ہال دلاور خاں یا اس کے بیٹے ہوشنگ کے عہد کا ہی۔ یہ شہ نشین غیاث الدین کے آغازِ عہد میں یا اس سے بھی پیشتر محمود خلجی کے زمانے میں تعمیر ہوئے۔ اوپر کے چبوترے کی آرائشی دیوار میں بندوقوں کے لیے سوراخ ہیں لیکن بعد ازاں شاید بند کر دیے گئے۔

---

[1] شہ نشین کے ہر جانب تین محرابیں ہیں۔ درمیانی محرابیں بہ نسبت بہرے کی محرابوں کے زیادہ کشادہ ہیں۔ محرابوں کا طرز مانڈو کی اس ابتدائی عمارتوں کی محرابوں سے ملتا جلتا ہی۔

شہ نشین سے غروب آفتاب کا نظارہ سیاح کی زندگی کا ایک عجیب اور جدید تجربہ ہوگا لیکن اگر چاندنی راتیں ہوں تو کھانے کے بعد اس رومانی جگہ کا نظارہ ضرور کرنا چاہیے۔ عالمِ سکوت میں سیمیں کرنوں کا سحر وقت کے پردے کو اٹھا دیتا ہے اور وہ تخیّل میں دیکھتا ہے کہ بوسیدہ کھنڈر اپنی گزشتہ عظمت و شکوہ میں جگمگا اٹھے، سفرا بھڑکیلے لباسوں میں بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہیں، بادشاہ قدیمی طرز سے انصاف کر رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ شاید وہ یہاں پری پیکروں کی سرگوشیاں بھی سنیگا یا آرائشی دیوار سے مشاہدہ کرے گا کہ محاصرین و محافظین کے درمیان خوفناک جنگ ہو رہی ہے اور پھر دیکھے گا کہ فوجیں سڑکوں پر فاتحانہ شان سے گزر رہی ہیں اور نئے بادشاہ تخت نشین ہو رہے ہیں۔

"ہاتھی محل"

جامع مسجد اور ساگر تلاؤ کے درمیان، سڑک کے مشرقی جانب بہت سی قدیم عمارتیں ہیں جہاں سیّاح خیمہ گاہ یا بارنس کوٹھی سے (غالباً اس کا قیام گاہ یہیں ہوگا)، بآسانی پہنچ سکتا ہے۔ قیام گاہ سے آتے ہوئے پہلی عمارت جو نظر آئے گی وہ ہاتھی محل ہے۔ یہ ایک نہایت غیر شاعرانہ نام ہے جو عمارت کے فیل پا کے ایسے موٹے ستونوں کی وجہ سے رکھا گیا۔ ستونوں کا گھیر ۱۲ فٹ ۱۰ انچ ہے اور وہ واقعی ان محرابوں کے ارتفاع یا درمیانی فاصلے کے اعتبار سے غیر مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ یہ پیشتر بتایا جا چکا ہے کہ مانڈو میں گول ستون بہت زمانے کے بعد مروّج ہوئے اور عمارت کو زیادہ مستحکم کرنے کے لیے مختلف مقامات پر بہت موٹے بنائے جانے لگے تھے۔

عمارت کا نقشہ بارہ دری کے نقشے سے ملتا جلتا ہے۔ اس میں ۱۲ محرابیں (تین ہر جانب) اور اس پر ایک گنبد ہے۔ گنبد کی کرسی باہر سے مثمّن ہے۔ اور غیر معمولی طور پر بلند ہے۔ ایک زمانے میں یہاں رنگین چوکے بنے کیونکہ چونا جس میں وہ لگے تھے اب بھی نظر آتا ہے۔ بارہ دری ۲۷ فٹ ۵ انچ مربع ہے اور اس کے بیچ میں ایک قبر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت دراصل تفریح کے لیے بنائی گئی تھی کیونکہ ملحقہ مسجد جو ایک مسلمان کے مقبرے میں ضرور شامل ہوتی ہے اصل عمارت کے بعد تعمیر ہوئی ہے اور اس قدر ملا کر بنائی گئی ہے کہ اس کے بیرونی تعمیری تاثر کو تباہ کر دیتی ہے۔

مسجد میں دوہرا دالان ہے جو دس حصوں میں ان ستونوں سے تقسیم کیا گیا ہے جن پر قوسی چھت قائم ہے۔ مشرق کی جانب پانچ در ہیں ہر ایک میں دو محرابیں ہیں جو اینٹ چونے کے مربع ستونوں پر قائم ہیں۔

مسجد سے ملے ہوئے مقبرے کے مشرقی جانب بھی دالان ہے جس کے صدر میں حوض ہے۔ اس دالان کی چھت گر گئی ہے لیکن یہ شاید قعب نما تھی پہلوؤں میں خم تھے لیکن بیچ میں بالکل چپٹی تھی۔ یہ دالان مقبرے کی خانقاہ کے طور پر تھا۔ اس کے طرزِ تعمیر سے پتا چلتا ہے کہ عمارت نصیر الدین خلجی کے آخری عہد میں تعمیر ہوئی یعنی تقریباً پندرھویں صدی کے آخر یا سولھویں صدی کے آغاز میں۔

دریا خاں کا مقبرہ

ہاتھی محل کے شمال میں کچھ دور ایک اور مقبرہ ہے جو دریا خاں کے نام سے منسوب ہے۔ یہ عہد محمود دوم (۱۵۱۰ء تا ۱۵۲۶ء) میں مانڈو کے دربار شاہی کا اعلیٰ

حاکم تھا۔ اس قدیم عمارت کا فنِ تعمیر بیحد دلچسپ ہی کیونکہ یہ اس دورِ تغیر کا اظہار کرتا ہی جس میں جامع مسجد و مقبرۂ ہوشنگ کا طرزِ تعمیر دائی کے محل اور چھپّن محل کے طرز میں تبدیل ہوا۔

مقبرہ ایک چبوترے پر بنا ہی جو زمین سے ۵ فٹ بلند ہی اور بالکل اوپر ۵۷ فٹ مربّع ہی۔ عمارت کے بیرونی دروازے کا اگلا رُخ سرخ رنگ کا ہی اور میناکاری کے چوکے نہایت خوش مذاقی سے جمائے گئے ہیں۔ ان کی ترتیب میں تنوّع ہی اور یہ مختلف رنگ کے ہیں مثلاً سبز، نیلا، ہلکا نیلا، زرد اور سفید۔ دیواروں پر افقی دھاریاں اور محرابوں کے فیل پاؤں کے نزدیک مثمّن ستون رسمی طرز کے ہیں۔

چھت کے کونوں پر چھوٹے چھوٹے بدنما گنبد ہیں اور اصل گنبد کی شکل بھی بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ گنبد پر پلاسٹر کی سطح ڈاٹیں ہیں جو رسمی طرز کی ہیں اور ظاہرا مسجد کے گنبد کی نقل ہیں۔ گنبد اندر سے نہایت خوشنما ہی اور محرابیں جو مقبرے کے کونوں پر ڈالی گئی ہیں حسنِ تناسب کے احساس کا اظہار کرتی ہیں۔

مقبرے کا ہال ۳۰ فٹ ۲ انچ مربّع ہی اور داخل ہونے کا ایک محراب دار دروازہ شمال کی جانب ہی۔ اندر کوئی آرائش نہیں ہی سوائے چھوٹی چھوٹی محرابوں کے جن میں گہرے نیلے رنگ کے چوکے ہیں۔ روشنی اور ہوا کے لیے دیواروں میں نہایت خوشنما پتھّر کی جعفریاں لگی ہیں۔ وہاں تین قبریں ہیں۔ درمیانی قبر کے تابوت کی کندہ کاری محمود خلجی کے تابوت کی کندہ کاری سے ملتی جلتی ہی۔

اصل عمارت کے مغرب میں کچھ ہال ہیں جن کی چھتیں محراب دار ہیں لیکن اب وہ شکستہ حالت میں ہیں۔ ان میں سے ایک کا کوٹھا نہایت خوبصورت ہی۔

یہ اس چھوٹے سے تالاب کے اوپر ہی جو عمارت کے مغرب میں ہے۔

مقبرے کے چاروں طرف دُوسری عمارتیں ہیں اور ایک شکستہ مسجد احاطے کے باہر مغرب میں نظر آتی ہے شمال میں چند گنبد ہیں جن میں سے تین پر ویسے ہی نقش ونگار بنے ہیں جیسے رُوپ متی کے شہ نشین پر۔ یہ مقام شاید کوئی خاص محلہ تھا جیسا کہ باغات، نہر، تفریح گاہوں وغیرہ کے آثار سے پتا چلتا ہے۔

"مقبرہ دریا خاں کے شمال کا مقبرہ"

یہ مقبرہ ابھی تک اچھی طرح محفوظ نہیں کیا گیا ہے لیکن وہ اپنے برآمدے کی وجہ سے قابلِ دید ہے۔ یہ برآمدہ ہندو مندر کے چکّردار راستے کی وضع کا ہے۔ برآمدے کے کونوں پر نقش دار گنبد ہیں لیکن وہ ناموزوں ہیں کیونکہ مرکزی گنبد کے مقابلے میں بہت بڑے ہیں۔ مانڈو کی ابتدائی عمارتوں میں بڑے گنبد کے چاروں طرف چھوٹے گنبدوں کا جھرمٹ ہوتا ہے لیکن یہاں وہ عمارت کے کونوں پر بنائے گئے ہیں اور ان سے درمیانی دور کا پتا چلتا ہے یہ دور اول الذکر اور گنبددار شہ نشینوں کے زمانے کے درمیان کا ہے۔ گنبددار شہ نشین عمارتوں کے کونوں پر بنے ہیں جیسی باز بہادر کے محل پر۔ مقبرے کا مرکزی حصہ ۲۴ فٹ ۳ انچ ہے اور اس کے چاروں طرف ایک برآمدہ ۱۱ فٹ ۹ انچ چوڑا ہے۔ مقبرے کے ہال کی محرابوں میں اینٹ کا کام کیا گیا ہے۔ یہ کام بعد کا معلوم ہوتا ہے جبکہ مقبرے میں لوگوں نے سکونت اختیار کی۔

مقبرے کے احاطے میں ایک مسجد ہے جس کی نمازگاہ کا طول وعرض ۸۰ فٹ ۹ × ۳۶ فٹ ۲ انچ ہے۔ اس میں مشرق کی جانب نو محراب دار در ہیں۔ درمیانی در سے شمال وجنوب میں چوتھا اور چھٹا در بہت چھوٹا ہے لیکن نمازگاہ کی بیرونی

غلام گردش کے مغرب میں یہ بہت ہی غیر موزوں نظر آتے ہیں۔ یہ ظاہراً ہال کے مرکزی درجے میں تناسب پیدا کرنے کے لیے تعمیر کیے گئے تھے۔ اس مرکزی درجے میں شمال وجنوب کی جانب دو کشادہ محرابیں ہیں۔

نمازگاہ کی چھت سات گنبدوں پر مشتمل ہے ایک صدر میں ہے اور تین شمال وجنوب کی جانب ہیں۔ عمارت کے کونوں میں چھوٹے چھوٹے مینارے ہیں جن پر نقش ونگار بنے ہیں۔

مسٹر ہنری کزنس نے سر ٹوٹس رو کی جائے قیام مانڈو میں تاراپور دروازے کے قریب متعین کی تھی جہاں اب بھی ایک چھوٹی سی مسجد موجود ہے جس کو ابھی حال میں محفوظ کیا گیا ہے مسجد میں دوہرا دروازہ ہے جو طول وعرض میں ۳۶ فٹ × ۲۷ فٹ ۵ انچ ہے۔ اس پر حیرت ہوتی ہے کہ سفیر کی اتنی بڑی جماعت یہاں کیونکر مقیم ہوئی ہوگی۔ پھر یہ سڑک کے کنارے بھی نہیں ہے اور اس کے کمرے ایسے نہیں ہیں کہ ان کی تعریف شہنشاہ کرتا، شہنشاہ نے اس کی ستائش اس وقت کی تھی جب وہ سر ٹوٹس رو سے اس کی جائے اقامت پر ملنے آیا تھا۔[1]

بعض محققین نے اور آگے شمال میں اس کا پتا اس سڑک کے کنارے لگایا ہے جو چھپن محل سے تاراپور دروازے کو جاتی ہے۔ کھنڈرات میں ایک پنجا اینٹوں کا احاطہ اور کچھ کمرے مغربی جانب ہیں۔ اس کے قرب میں ایک مسجد اور ایک مقبرہ ہے لیکن کھنڈروں کا طرز جائے اقامت کے ان بیانات سے مطابقت نہیں رکھتا جو حالات سفارت میں ملتے ہیں۔

---

[1] مسجد کے مقابل ایک ٹیلہ ہے جس نے کسی قدیم عمارت (مقبرہ؟) کو چھپا لیا ہے لیکن اس کا طول وعرض ایسا ہے کہ کوئی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ سر ٹوٹس رو کی جماعت یہاں قیام کر سکی ہوگی اور جہانگیر نے اس کی تعریف کی ہوگی۔

دورانِ قیام میں جہانگیر شاہی احاطے میں ضرور مقیم ہوا ہوگا لیکن ہوا خوری کے لیے وہ روپ متی کے شہ نشین تک جاتا ہوگا۔ یہ مقام مانڈو میں سب سے زیادہ بلند ہے اور وادی نیماڑ کا بہترین نظارہ یہاں سے ہوتا ہے۔ مختلف شراب نوشی کے دور اور جشن ساگر تلاؤ یا ریوا کنڈ کے نواح میں ہوتے ہوں گے۔ شہنشاہی جماعت کے جلوس کا راستہ ان قدیم عمارتوں کی جانب ہے اور شاید یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سفیر کی جائے قیام کا پتا ان عمارتوں میں چلے گا جو دریا خاں کے مقبرے کے چاروں طرف ہیں۔ یہ اپنی گنجایش، سڑک کے قرب اور شاہی قیام گاہ کے فاصلے کے اعتبار سے اس بیان کے مطابق ہیں جو ٹومس رو کے جائے قیام کے متعلق درج ہے۔[1]

لال محل (یا لال بنگلہ)

لال محل جس کا نام اب لال بنگلہ ہے شاہانِ مالوہ کے گرمیوں میں رہنے کی جگہ تھی۔ یہ بیچ جنگل میں ہے۔ محل کے لیے ایک خاص سڑک ہے۔ یہ اس شاہراہ سے نکلی ہے جو دریا خاں کے مقبرے اور جامع مسجد کے درمیان سے جاتی ہے۔ محل کے دراصل تین حصّے تھے۔ صدر کا حصّہ استقبال کے لیے مخصوص تھا اور دو کنارے والے حصّوں میں لوگ رہتے تھے صدر اور مغرب کے حصّے کے چاروں طرف بلند دیوار تھی جو معلوم ہوتا ہے بعد میں تعمیر ہوئی جیسا کہ

---

[1] ٹیری لکھتا ہے "ٹومس رو نے مسجد و مقبرے کے کھنڈروں میں ایک مکان تعمیر کیا اور وہاں اس نے مع اپنے "خاندان" کے برسات گزاری۔ اس کے ہمراہ اس کے ناظم، خاندانی پادری، باورچی، ۲۳ انگریز اور ۶۰ ہندستانی نوکر تھے"۔ ٹیری کے حالاتِ سفر۔ ص ۶۹ اور ۲۲۸۔

اس کی بدنمائی معمولی اینٹ چونے سے ظاہر ہے۔ دروازہ قدیمی ہے اور سنگ سرخ کا بنایا گیا ہے۔

دروازے کے بعد ایک صحن ۲۱۲ فٹ × ۵۷ افٹ وسیع ہے۔ عمارتیں جو یہاں تھیں زیادہ تر گرگئیں اور محض ایک چبوترہ اور بارہ دری کے کھنڈرات اب نظر آتے ہیں۔ بارہ دری ۱۰ افٹ ۵ انچ مربع ہے اس کی کرسی ۳ فٹ ا انچ بلند ہے۔ چھت گرگئی ہے لیکن یہ محراب دار تھی اور محرابیں جن پر وہ قائم تھی سالم ہیں اور ان سے حسنِ تناسب کا پتا چلتا ہے۔ صحن کے شمال مشرق کی طرف ایک بڑا سا کنواں مع جگت کے ہے۔ بہت سے محراب دار طاق چاروں طرف بنائے گئے ہیں جن سے احاطے کی دیواروں کا طرز تبدیل ہوگیا ہے۔ اینٹ کے بدنما پیوندوں سے ظاہر ہے کہ یہ سب بعد کے اضافے ہیں۔

محل کے مغربی حصے میں ایک صحن ہے جس کے چاروں طرف دیوار ہے۔ یہ مشرق سے مغرب تک ۱۲۰ فٹ ۳ انچ ہے اور شمال سے جنوب تک ۱۰۵ فٹ ۱۱ انچ۔ عمارت کا نقشہ ایک دالان پر مشتمل ہے جس کا طول وعرض ۶۰ فٹ × ۲۰ فٹ ہے۔ اس میں ایک غلام گردش بھی ہے۔ اس کے دونوں سرے (مشرق ومغرب) پر دو ہال ہیں۔ ان ہال کے شمالی سروں پر دو کمرے ہیں۔ ہر ایک کمرہ ۱۲ فٹ ۹ انچ × ۹ فٹ ۱۰ انچ ہے۔ کمرے اس طرح بنائے گئے ہیں کہ وہ دالان کی پشت پر غلام گردش کے مشرقی و مغربی کناروں سے ملحق ہیں۔

دالان میں سات در صحن کی جانب ہیں۔ ہر ایک در میں دو محرابیں ہیں جو مربع ستونوں پر قائم ہیں۔ عمارت میں کوئی آرائش نہیں ہے لیکن ستونوں کے طرز اور محرابوں کے تناسب نے حسنِ سادہ کی شان پیدا کر دی ہے۔

چھت اکیس حصّوں میں منقسم مثمن محرابوں پر مشتمل ہے۔ دالان کی پشت پر جو غلام گردش ہے وہ کچھ تاریک ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ گرمیوں میں جب کہ سورج کی روشنی بیرونی حصّوں میں ناقابلِ برداشت ہوتی ہوگی تو یہاں قیلولہ کیا جاتا ہوگا۔

دوہرے ہال جو دالان کے ہر ایک سرے پر بنے ہیں بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں جیسا کہ اس اینٹ چونے سے ظاہر ہوتا ہے جو محل کے درمیانی حصّے کے صحن میں نظر آتا ہے۔

محل کے مشرقی حصّے میں ایک تیہرا ہال ہے۔ اس ہال کے ہر ایک سرے پر مشرق و مغرب کی جانب مستطیل کمرے ہیں (۲۷ فٹ ۳ انچ × ۱۲ فٹ ۴ انچ) عمارت کے سامنے ایک وسیع چبوترہ ہے۔ صدر میں ایک مستطیل حوض ہے۔ عمارت کے ستون اور محرابیں اسی طرز کی ہیں جیسی محل کے مغربی حصّے میں ہیں۔ چھت بھی اسی طرز کی ہے۔ ہال کی شمالی دیوار میں ایک آبشار اور نہر کا پتا چلتا ہے۔ نہر اینٹ کی بنی ہے اور ظاہرا بعد میں اضافہ کی گئی ہے۔ عمارت کا اگلا رُخ سرخ رنگ کا ہے لیکن اس پر ابھی حال میں چونا پھیرا گیا ہے۔

صحن کے شمال مشرقی کونے میں ایک بڑا سا پکّی جگت کا کنواں ہے۔ اس کنویں کے مشرقی طرف حمام کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ ایک نہر کے آثار ابھی پائے جاتے ہیں اور عمارت کے چاروں طرف مختلف آبشار ہیں۔

"چشتی خاں کا محل"

دُوسری عشرت گاہ تاریخی اعتبار سے بعد میں (سولھویں صدی کے نصف آخر؟) پہاڑی کے اس کنارے پر تعمیر کی گئی ہے جہاں سے کیکڑا کوہ کی وادی تین جانب نظر آتی ہے۔ محل تک ایک پگڈنڈی جاتی ہے جو گاڑی دروازے

کے پاس شاہراہ سے ملتی ہے۔ یہ پگڈنڈی پہاڑی کے کنارے، بجانب مشرق تقریباً تین فرلانگ تک جاتی ہے جہاں یہ عمارت ہے۔

محل بیحد شکستہ ہوگیا ہے اور اس کے نقشے کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔

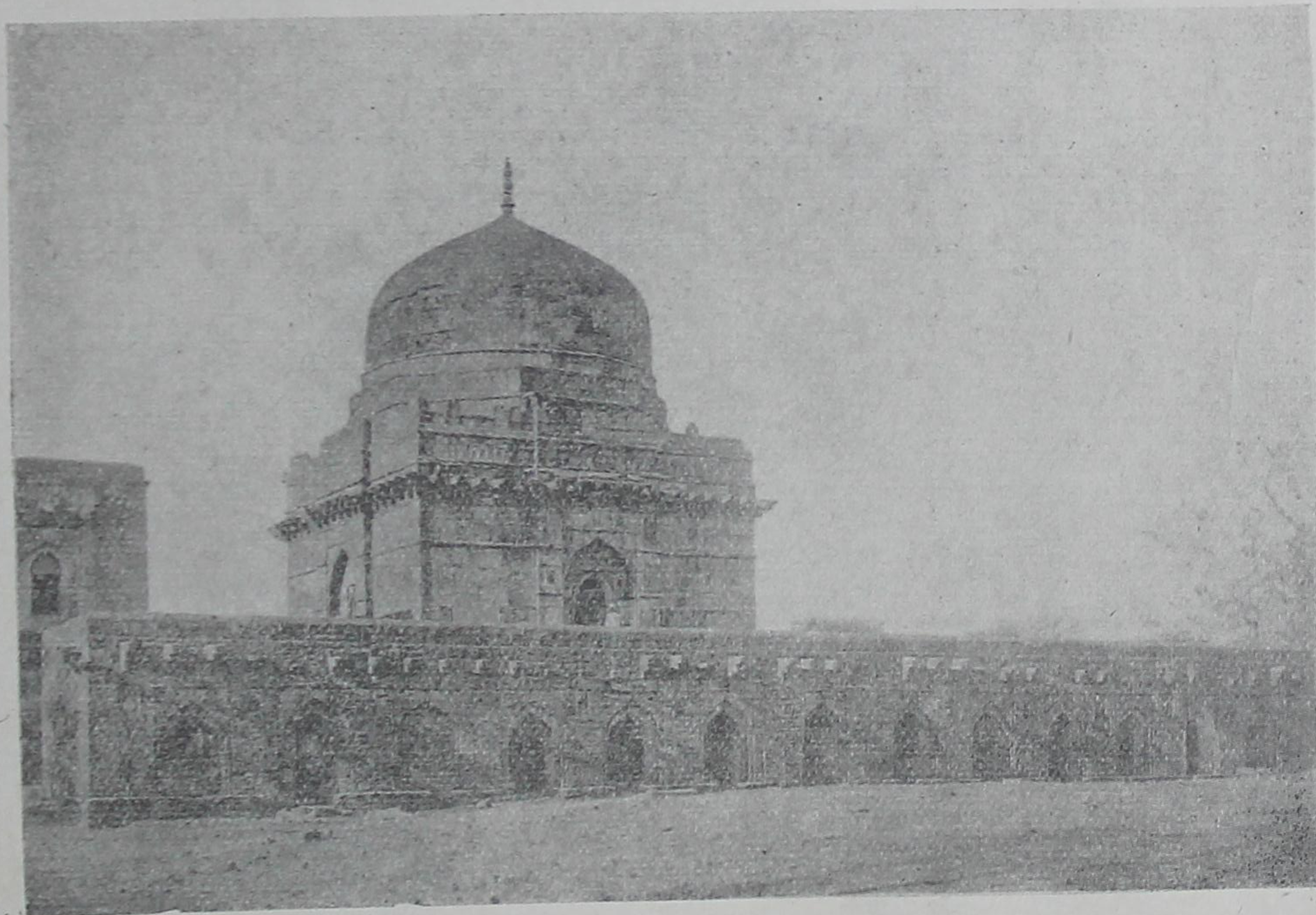
جنوب کی جانب ایک مستطیل ہال ہے جس کے ہر ایک سرے پر ایک کمرہ ہے (۱۳ فٹ ۳ انچ × ۱۲ فٹ ٦ انچ) کے سامنے ہر ایک کنارے پر کمرے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس کمرے میں جو اصل ہال کے مشرقی کنارے پر ہے۔ دیواریں چوکوں اور تصویروں سے آراستہ ہیں ایک کتبہ فارسی نظم میں ہے۔ یہ نظم ایک خاص طرز میں لکھی گئی ہے جو اس ویرانے ماحول میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

شہ نشین سے سیڑھیاں ایک کوٹھری تک گئی ہیں جو غالباً شراب رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اسی کوٹھری کے سلسلے میں کچھ کمرے اصل ہال کے نیچے بنے ہیں۔ ان کمروں کی قوسی چھت ہے۔

ہال اور اس کے ملحقات کے سامنے ایک دل کش صحن تھا اور اس کے شمال کی جانب ہال اور کمروں کا ایک سلسلہ تھا۔ خاص ہال ۱۲ فٹ ۵ انچ × ۳٦ فٹ ٦ انچ ہے اس کے مشرق میں ایک دوسرا ہال ہے۔ مغرب میں ایک چھوٹا کمرہ ہے۔ ان کی چھتیں محراب دار ہیں اور آرائشی نقش و نگار جو پلاسٹر میں بنائے گئے ہیں ابھی سالم ہیں۔

صحن کے کنارے اور بعد الذکر ہال کے سامنے چند کمرے تھے جن کا پتا دیواروں کے کھنڈر سے چلتا ہے۔

محل ظاہرا برسات میں قیام کرنے کے لیے تعمیر ہوا تھا۔ یہ وہ موسم ہے جب وادی پر سبزہ چھایا ہوتا ہے اور پہاڑی چشمے اور آبشار نظارے کے



چھپن محل

شکوہ میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

"چھپن محل"

یہ ایک رئیس کا مقبرہ ہے اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کا نام چھپن محل اس سبب سے ہوا کہ سمت چھپن میں اس کی مرمت کی گئی تھی۔ یہ عمارت شاید مانڈو کے فنِ تعمیر کے تیسرے دور کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ دور عہدِ ناصرالدین کے آخر میں شروع ہوا اور اس وقت تک جاری رہا جب مغلوں[1] نے مالوے کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔

مقبرہ سنگِ سرخ کا ہے اور ایک چبوترے پر ہے جو زمین سے ۱۳ فٹ بلند ہے۔ اوپر ۱۳۲ فٹ مربع ہے۔ چبوترے کے تہ خانے میں جنوب کی جانب کمرے ہیں۔ ان میں محراب دار در ہیں۔ یہ ملازمین و زائرین کے قیام کے لیے

---

[1] دائی کا محل، دائی کی چھوٹی بہن کا محل اور جالی کا محل جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اسی تیسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض نقادوں کو یہ تقسیم ممکن ہے من مانی نظر آئے۔ لیکن جامع مسجد کا طرزِ تعمیر جہاز محل یا ملک مغیث کی مسجد سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ ان دونوں قدیم عمارتوں کا طرز چھپن محل اور اسی قسم کی عمارتوں سے لگاؤ رکھتا ہے۔ ان قدیم عمارتوں کی خصوصیات کا مطالعہ کرنے میں یہ فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دورِ اول کی یہ عام خصوصیت ہے کہ اسلامی صناعی کے مقابلے میں ہندو صنعت پست درجے کی تھی درمیانی دور میں ہندو معمار کو (جہاں بے روک ٹوک کام کرنے کا موقع ملا) اس نے اسلامی طرزِ تعمیر و نصب العین سے غفلت برتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عمارتوں میں اسلامی رجحانات بڑھا چڑھا کر پیش کیے گئے (مثلاً ہنڈولا محل) آخری دور میں دونوں کی تعمیری روایات مل جل گئیں اور گو دورِ اوّل کی حسن سادگی و اثر جاتا رہا لیکن (بقیہ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۱ پر)

بنائے گئے ہیں۔ مقبرے کی رفعت میں اضافہ کرنے کے لیے معمار نے کوٹھے پر ایک چبوترا ۳ فٹ ۲ انچ بلند بنایا ہی اور اس پر مقبرہ ہی

عمارت کا عام طرز باہر سے بیحد موثر ہی اور دبدبے کے علاوہ اس میں غضب کا تناسب ہی۔ ہندو طرز کی آرائشیں اور دیوارگیریاں اسلامی نمونے کی کندہ جالیوں کے طرز سے مل جاتی ہیں۔ محرابیں اور قوسی گنبد حسنِ تناسب کا اظہار کرتے ہیں اور تعمیری اصولوں کی واقفیت کا پتا چلتا ہی۔

مقبرے کے ہال میں داخلے کا محراب دار دروازہ جنوب کی جانب ہی اور طول و عرض میں ۳۱ فٹ ۶ انچ ہی۔ ہال کے کونوں میں ڈاٹیں ہیں اور ان کے اوپر آرائشی محرابیں ہیں جن میں نیلے ٹائیل ہیں۔ زیادہ بلندی پر گنبد کے گھیرے سے ملی ہوئی ایک جھالر ہی جس پر نازک کندہ کاری کی گئی ہی لیکن آرائش عموماً کمی کے ساتھ کی گئی ہی اور مقبرے کی سادگی و سنجیدگی کے مطابق ہی۔

چبوترے کے مغربی کنارے پر چند قدیم کمرے تھے جو ابھی حال میں سیاحوں کی سہولت اور آرام کے لیے ریاست دھار نے جدید ضروریات کے مطابق درست کرائے ہیں چونکہ اس تبدیلی کا خیال میجر بارنس کو آیا اس لیے یہ کمرے ان کے نام سے منسوب ہوئے اور بارنس کوٹھی[1] کہلاتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۱۳) اجزائے ترکیبی میں وہ مغائرت نہیں رہی جو دورِ دوم کی عمارتوں میں موجود ہیں۔

[1] مصنف کو ان کمروں میں قیام کرنے کا اتفاق اور ریاست دھار کی مہمان نوازی کا شرف مانڈو کے دوران قیام مارچ ۱۹۲۷ء میں حاصل ہوا۔ حسنِ اتفاق سے اسی زمانے میں ہندوؤں کا تہوار ہولی تھا۔ ہندستانی دہقانی لڑکی کے مقید جذبات اسی موقع پر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ شخص جس نے اس تہوار میں راجپوتانہ اور مالوہ کے گانو کی رنگ رلیاں اور تماشے دیکھے ہیں وہ ان کو آسانی سے بھول نہیں سکتا۔

"نیل کنٹھ محل"

ہندوؤں کے دیوتا شیو کا ایک لقب 'نیل کنٹھ' ہے۔ شروع میں اس جگہ کوئی مندر ضرور تھا۔ ممکن ہے یہ چھوٹا سا ہو اور اس دیوتا کے نام سے منسوب ہو۔ اس کے باوجود کہ عمارت کا طرز اسلامی ہے، اس کا یہی نام ساڑھے تین سو صدی سے چلا آ رہا ہے۔ محل کی جگہ نہایت عمدہ ہے جو پہاڑی کے ڈھال پر واقع ہے۔ یہاں سے وادی کا نظارہ نہایت شاندار ہے۔ شہنشاہ جہانگیر اپنے دوران قیام میں بیگمات کے ہمراہ یہاں آیا اور لکھتا ہے کہ یہ مانڈو کے خوشگوار ترین مقامات میں سے ایک مقام ہے۔

یہ محل اس سڑک پر واقع ہے جو چھپن محل سے تارا پور دروازے تک جاتی ہے۔ تالاب کے آثار وہاں موجود ہیں اور کچھ فاصلے پر محل کا زینہ ہے۔ عمارت میں ایک صحن ہے اور مشرق، مغرب اور جنوب کی جانب کمرے ہیں۔ نظارۂ وادی سے لطف اندوز ہونے کے لیے شمال کی جانب کھلا ہوا ہے صحن کے صدر میں ایک حوض ہے جس میں پانی ایک نہر یا آبشار سے آتا تھا جو جنوبی کمروں کی کرسی کے پاس بنا تھا۔

صحن کے مشرق و مغرب میں کمرے ہیں اور ہر ایک کی چھت نیم گنبد شکل کی ہے۔ ان میں صحن کی جانب صرف ایک در ہے جس میں ایک بڑی سی محراب ہے ان کمروں کا فرش بہ نسبت صحن کے زیادہ بلند ہے لیکن وہ جنوبی کمروں کی سطح سے نیچے ہیں۔ جو آبشار کے لحاظ سے ۶ فٹ ۶ انچ صحن سے بلند بنائے گئے ہیں۔

عمارت کا نقشہ جنوبی جانب ایک داخلی کمرے پر مشتمل ہے جو مستطیل ہے اور اس کے صدر میں ایک مثمن حوض ہے۔ اس حوض میں پہاڑی کے ایک

تالاب سے پانی آتا تھا اور ایک نہر کے آثار عمارت کی پشت پر ابھی تک موجود ہیں۔ اس کمرے کی جنوبی دیوار میں آبشار بنا ہی۔ جہاں سے پانی حوض میں گرتا ہی۔ اس کمرے کے سامنے ایک اور کمرہ ہی جہاں ایک بڑی محراب کے بیچ سے صحن و وادی صاف نظر آتے ہیں۔ یہ خاص بیٹھنے کا کمرہ تھا اور اس کی دیواروں پر شہنشاہ اکبر نے کچھ کتبات کندہ کرا دیے تھے جن میں اس کے خاندیس اور دکن کے حملوں کا ذکر تھا۔ ان میں کچھ اشعار بھی ہیں جو دنیاوی جاہ و جلال کی بے اعتباری کا ذکر بڑے موثر طرز میں کرتے ہیں۔

شاہ بداغ خاں کے محل کے کتبے

کتبۂ شرقی دیوار

در تاریخ ۴۴ سنہ الٰہی معافق سنہ ۱۰۰۸ھ بندگانِ اعلیٰحضرت جہاں پناہ فلک بارگاہ ظل اللہ متوجۂ فتح دکن بودند بدیں جا عبور افتاد

تا کے گوئی بچرخ شد خانۂ ما — خندند ہمہ بر دلِ دیوانۂ ما

زافسانۂ دیگراں بیا عبرت گیر — زاں پیش کہ بشنوند افسانۂ ما

کتبات غربی دیوار

(۱) بتاریخ سنہ ۱۰۰۹ھ حضرت اکبر بادشاہ فتح خاندیس و دکن نمودہ عازم ہند شدند۔

حررہ محمد معصوم

---

(۲) حضرت ظل اِلٰہ اکبر بادشاہ فتح دکن و خاندیس نمودہ در سنہ ۱۰۰۹ھ عازم ہند شدند ۝ قائلہ نامی

ابیات

دیدم چغدے نشستہ در صبح پگاہ　　　　بر کنگرۂ مقبرۂ شیر دان شاہ
فریاد کناں زروی عبرت میگفت　　　　کو آں ہمہ حشمت کجا آں ہمہ جاہ

کتبۂ محراب

بیرونی جانب

امر ببنائی ہذہ العمارۃ الدلکشا بعہد السلطان الاعظم الخاقان العادل الاکرم مولی ملوک العرب والعجم ظل اللہ فی الارضین قہرمان الماء والطین رافع رایات المجاہدات والمغازی ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ ،

کتبہ فریدوں حسین ابن حاتمی سنہ ۹۸۲ ہجری

کتبۂ محراب

اندرونی جانب

تواں کردن تمامی عمر را مصروف آب و گل
کہ شاید یک دمے صاحبدلے اینجا کند منزل
کتبہ شاہ بداغ خاں سنہ ۹۸۲ ہجری

۔ اس کتبے کا لکھنے والا غالباً عربی سے واقف نہ تھا۔ اسی وجہ سے دلکشا کو الف و لام کے اضافے سے عربی بنایا ہے۔ اسی طرح قہرمان کا لفظ فارسی ساخت کا ہے۔ غ۔ ی۔

کمرہ مع کتبات کے ۱۷ فٹ ۶ انچ × ۱۳ فٹ ۳ انچ ہے اور اس کی محراب دار چھت نیم قوس شکل کی ہے کمرے کے ہر ایک سرے پر ایک مربع کوٹھری ہے جو ہر طرف سے ۱۱ فٹ ۲ انچ ہے۔

پورا محل سنگ سرخ سے تعمیر ہوا ہے اور اس میں مغلیہ طرزِ تعمیر کی خصوصیات پائی جاتی ہیں مثلاً جھروکے نما کمرے جن میں بلند محرابیں صحن کی طرف ہیں اور کمروں میں نہر اور فوارے اسی طرز کے ہیں جیسے لاہور، دہلی اور آگرے میں۔ اس میں کوئی خاص تعمیری شان نہیں ہے لیکن اس کا طرز اکبر کی دوسری عمارتوں کے طرزِ تعمیر سے بہت ملتا ہے۔

"سون گڈھ"

دو فرلانگ چل کر یا موٹر میں جاکر بشرطیکہ برسات میں راستہ کٹ نہ گیا ہو سیاح نیل کنٹھ کے محل سے سون گڈھ کی پہاڑی کے دامن تک پہنچے گا۔ پہاڑی کی چوٹی اونٹ کے کوہان سے ملتی ہے اور مانڈو کی بلندی سے نہایت شاندار نظر آتی ہے۔ جنوب و مغرب کی جانب اینٹ چونے کی ٹھوس چار دیواری ہے۔ دوسری جانب قدرتی کھڑی چٹانیں ہیں جو حفاظت کرتی ہیں۔ دیوار کی مضبوطی کے لیے گول برج بنائے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض میں بدنما ساخت کے توپ خانے کے ٹکڑے موجود ہیں۔

پہاڑی سے ملا ہوا ایک دروازہ ہے جس کا طرزِ تعمیر بالکل جدید ہے کہتے ہیں کہ ایک مرہٹہ دیوی مینا بائی نے مانڈو کے دورانِ قیام میں اس کو دوبارہ تعمیر کرایا ہے دروازے میں محراب دار در ہیں اور اس کے اوپر دو مچان ہیں جو اینٹ کے بنے ہیں۔ دروازے کے بالائی اگلے سرخ رُخ کے مقابلے

ہیں یہ پہچان آنکھوں میں کھٹکتے ہیں۔ ان کی نوک دار محرابیں طرزِ عمارت کے اعتبار سے بے جوڑسی ہیں۔ شیر اور ہاتھی کی مورتیں جو پلاسٹر میں بنائی گئی ہیں دروازے کے داخلی جانب نظر آتی ہیں۔

مانڈو کی بلندی اور اس پہاڑی کے دروازے کے درمیان ایک راستہ معلوم ہوتا ہے جو ایک غار کو بھر کر بنایا گیا ہے۔ دروازے کے سامنے سے وادی کا نظارہ نہایت حیرت انگیز ہے اور نیچے مقبروں اور کاروان سرائے کے کھنڈر ہیں جہاں پہنچنے کے لیے لوہانی دروازے میں ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔

ایک پگڈنڈی پہاڑی کی چوٹی کو جاتی ہے لیکن چڑھائی نہایت دشوار اور بعض مقامات پر خوفناک ہے۔ اگر کوئی سیاح جوش وخروش میں اوپر چڑھے تو اس کو وہ سیدھی چٹانیں نظر آئیں گی جہاں گجرات کے بادشاہ بہادر نے خود اپنے کو اور اپنے گھوڑوں کو اس وقت نیچے لٹکوا دیا تھا جب ہمایوں کی فوجوں نے ۱۵۳۴ء میں اس کا محاصرہ کیا۔ وہاں کچھ قبریں، ایک مسجد کے کھنڈر اور ایک حوض ہے ایک قبر "پیر غائب" کے نام سے منسوب کی جاتی ہے۔ یہ پیر انسانی شکل اختیار کر کے مسافروں کی مصیبت میں دست گیری کرتے ہیں لیکن جب ان کی مدد کی ضرورت نہیں رہتی تو وہ روپوش ہو جاتے ہیں۔

"تاراپور دروازہ"

یہ دروازہ مانڈو پلیٹو کے جنوب و مغرب میں واقع ہے۔ یہ تاراپور گانو کے سامنے ہے جو نیچے میدان میں آباد ہے[1] پہاڑی کی ڈھال دروازے کی

---

[1] سیاح اس دروازے تک بیل گاڑی کے راستے سے بھی پہنچ سکتا ہے۔ موٹر چھپن محل سے جاڑے اور گرمیوں میں جا سکتا ہے۔

بیرونی محراب کے باہر بالکل سیدھی ہے اور گو وہاں ایک پختہ راستے کے نشانات اب بھی ہیں جو میدان کی جانب جاتا ہے لیکن یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ بھاری توپ خانے اور رتھ اسی راستے سے اوپر لائے گئے ہوں گے۔ کیونکہ محافظ بڑے بڑے پتھروں کو اوپر سے ڈھلکا کے ان کو آسانی سے کچل دیتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس جانب سے کئی مرتبہ حملہ ہوا اور ہمایوں کی فوجیں کہتے ہیں کہ اس دروازے کے پاس سے دیوار پر چڑھ کر قلعے میں داخل ہوئیں۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں جبکہ پہاڑی کی بلندی یہاں ایک ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔

دروازے میں ایک بیرونی محراب ہے جہاں سے کشادہ سیڑھیاں جن کے دونوں طرف زبردست دیواریں ہیں پہلے مغرب کی جانب پھر شمال کی طرف جاتی ہیں۔ یہاں ایک چبوترہ ہے جہاں اکبر نے ایک دروازہ مغرب کی طرف تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ دروازے کے جانب دیوار پر ایک کتبہ کندہ ہے جس میں یہ درج ہے کہ قلعے کا راستہ شہنشاہ کے نائب محمد حسین نے ۱۱۱۶ھ ۱۶۶۵ء میں درست کیا اور اس میں اضافہ کیا۔ اس میں شک نہیں کہ شاہی داخلے کے لیے اکبر کا دروازہ پیشتر کے دروازے پر ایک نمایاں اضافہ ہے کیونکہ اس دروازے سے قلعے میں ایسے مقام پر داخلہ ہوتا ہے جہاں ایک اچھا خاصا جلوس تیار ہو سکتا ہے۔

لیکن حفاظت کے لیے قدیمی داخلہ بہتر تھا کیونکہ اس چبوترے سے جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے سیڑھیاں مشرقی جانب جاتی ہیں جہاں وہ دروازہ ہے جو پہاڑی کے ڈھال پر بنا ہے۔ اس طرح حملہ کرنے والے ہر ایک مقام پر محافظین کی زد پر ہوتے۔ یہ قدیمی پُرپیچ راستہ دلاور خاں کے عہد میں تیار ہوا اور راستے کے اندرونی دروازے پر ایک کتبہ کندہ ہے جس سے تعمیر عمارت

کی تاریخ کا پتا چلتا ہے۔

قدیمی داخلی دروازے میں ایک محراب دار راستہ ہے کتبے کے لیے جگہ یوں نکالی گئی ہے کہ ایک سر محراب اینٹ چونے سے بھر دیا گیا ہے۔ دروازے کی چھت محراب دار تھی۔ اس کا ایک حصہ اب بھی سالم ہے۔ راستہ چھت کے نیچے ۱۳ فٹ ۶ انچ طول میں تھا اور اس کا عرض ۱۰ فٹ ۶ انچ تھا بیرونی دروازے کی محراب جہاں سے وادی نظر آتی ہے نہایت بلند اور زبردست تھی اور ابھی حال میں صحیح طور سے محفوظ کی گئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کا دروازہ جلدی میں تیار ہوا کیونکہ اس کے طرز تعمیر سے اعلیٰ صناعی کا پتا نہیں چلتا۔ داخلے کے دونوں جانب مربع برج ہیں جن کو بے تکان بڑھتے ہوئے درختوں نے تباہ کر دیا ہے لیکن مانڈو کے تحفظِ آثارِ قدیمہ کے لیے جو باقاعدہ اسکیم بنائی گئی ہے اس کے تحت میں جنگلی درخت اور خودرو پودے قدیم عمارتوں کے قریب سے صاف کیے جا رہے ہیں۔ اس طرح کچھ عرصے کے لیے ان کی تباہی کا ڈر باقی نہیں رہتا۔

"بھگوانیا دروازہ"

نیماڑ وادی کے سامنے ایک دروازہ قلعے کی جنوبی دیوار میں ہے۔ اس کا نام بھگوانیا دروازہ اس سبب سے ہوا کہ بھگوان پورگا تو دو تین میل کے فاصلے پر وادی میں واقع ہے۔ دروازے تک پیدل بھی جا سکتے ہیں۔ اس کے دو راستے ہیں۔ ایک تو روپ متی کے شہ نشین سے قلعے کی دیوار کے ساتھ اور دوسری ایک پگڈنڈی ہے وہ سڑک جو باز بہادر کے محل تک جاتی ہے اس سے یہ پگڈنڈی شہر پناہ کے پاس نکلی ہے اور گھومتی ہوئی سوا میل تک پہلے مشرق کی طرف

اور جنوب کی جانب جاتی ہے۔

اس دروازہ کا نقشہ ایک بیرونی داخلے سے شروع ہوتا ہے جس کے آگے پیچھے بلند محرابیں ہیں اور اوپر ایک محراب دار چھت ہے۔ چھت دار راستہ نیچے ۱۰ فٹ ۶ انچ کشادہ ہے اور محرابوں کا درمیانی فاصلہ ۹ فٹ ۶ انچ ہے۔ داخلے کے آگے جاکر راستہ کچھ وسیع ہو جاتا ہے یعنی ۱۳ فٹ ۲ انچ ہے۔ یہ پہلے شمال کی طرف اور پھر مغرب کی جانب جاتی ہے یہاں تک کہ داخلی دروازہ آجاتا ہے۔ دونوں داخلوں کے درمیان کا راستہ دونوں طرف بڑی زبردست دیواروں سے محفوظ ہے۔

اندرونی داخلہ بہ نسبت بیرونی کے زیادہ وسیع ہے اور اس کی محرابوں کا درمیانی فاصلہ ۱۱ فٹ ۶ انچ ہے۔ چھت محراب دار ہے اور اس کی روک کے لیے ایک محراب راستے کے آر پار بنائی گئی ہے جو داخلے کے سامنے اور پشت کی محرابوں کے بیچ میں ہے۔ چھت دار راستہ طول میں ۲۲ فٹ ۲ انچ ہے (۱۳ فٹ عرض ہے) اور اس کے دونوں طرف دربانوں کے لیے کمرے ہیں اور اسی طرح کے کمرے دوسری منزل پر ہیں۔ نگہبانوں کے کمرے جو زمین پر ہیں ان کی چھت مخروطی ہے جس کے جوڑوں پر ڈاٹیں ہیں۔

داخلے کی شمالی دیوار کے ساتھ سیڑھیاں بنائی گئی ہیں جو ان نگہبانوں کے کمروں کی جانب ہیں۔ جو پہلی منزل پر ہیں اور بعد میں یہ سیڑھیاں کوٹھے پر جاتی ہیں۔ کمروں کا نقشہ مستطیل ہے (۷ فٹ ۳ انچ × ۱۴ فٹ ۶ انچ) اور ان کی چھتیں تکونی ہیں۔

بھگوانیا دروازے کے آثار بہت چھوٹے ہیں لیکن اس کی محرابوں کا تناسب اچھی طرح قائم کیا گیا ہے۔

"جہانگیر پور دروازہ"

پہاڑی کی بلندی چونکہ مشرقی جانب اتنی زیادہ نہیں ہے جتنی دوسری جانب لہذا مضبوط دیوار سے مشرقی کنارہ محفوظ کر دیا گیا ہے اور محض ایک دروازہ اس جانب بنایا گیا ہے۔ دروازے کا نام جہانگیر پور دروازہ ہے۔

دروازے تک پہنچنا کچھ مشکل ہے کیونکہ پگڈنڈی جو اس ساگر تلاؤ کے آگے شاہراہ سے پھوٹتی ہے نالوں اور گھنے جنگل میں اکثر غائب ہو جاتی ہے۔ جنگل[1] میں درندے بکثرت ہیں اس لیے مناسب ہوگا کہ سیاح کسی بھیل کی رہنمائی میں یہ راستہ ٹٹو پر طے کرے۔

دروازے کا نقشہ دوسرے دروازوں کے نقشے کی طرح دوہرے داخلے پر مشتمل ہے جن کے درمیان سے پُرپیچ راستہ جاتا ہے۔ پھر بیرونی داخلہ اور اس کے پہلو کی دیواریں اس طرح بنائی گئی ہیں کہ وہ اندرونی داخلے کے لیے فصیلوں کا کام کرتی ہیں۔ بیرونی دروازہ اچھی حالت میں ہے لیکن اندرونی چھت گر گئی ہے اور راستہ ملبے کی وجہ سے بند ہو گیا ہے۔ داخلے کی دیوار کے ساتھ جو سیڑھیاں بنائی گئی ہیں وہ کوٹھے پر جانے کے لیے ہیں۔ یہاں ایک مچان کے آثار نظر آتے ہیں۔ مچان کے کندہ ستون اور سردل شاید اصل میں کسی ہندو عمارت کے تھے لیکن جہانگیر پور دروازے کا تعمیری طرز اسلامی ہے۔ یہ بھگوانیا اور تارا پور دروازوں کے طرز سے

---

[1] مصنف کی جماعت کے لوگ جب دروازے سے واپس آرہے تھے تو ایک نالے میں راستہ بھول گئے۔ چونکہ رات ہو گئی تھی لہذا بعض لوگوں کے خوف و پریشانی کا عالم اس سیاحت کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھے گا۔

ملتا جلتا ہے۔

"سات سو سیڑھی"

مانڈو کا بلند میدان شمال مشرق کی جانب ایک وادی کی وجہ سے کٹ گیا ہے۔ یہ وادی اندر کی جانب (مغرب) قلعے کے وسط تک چلی گئی ہے۔ چونکہ اس وادی کی تہ بعض مقامات پر زیادہ عمیق نہیں ہے اس لیے قلعے کی حفاظت کے لیے اس کا منہ ایک پشتے سے بند کر دیا گیا ہے۔ یہ پشتہ سیڑھیوں کی شکل میں بنایا ہے اسی سبب سے اس کا نام سات سو سیڑھی ہوا۔

رام پول دروازہ

یہ اشرفی محل سے کچھ فاصلے پر شمال مشرق میں واقع ہے اور شاید مانڈو کے اولین دروازوں میں سے ہے۔ داخلی محراب کے ذیل پائے اور نگہبانوں کے کمروں کے ستونوں سے ہندو صناعی کا اظہار ہوتا ہے اور چھت اسلامی طرز کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اصل عمارت میں کڑیاں استعمال کی تھیں لیکن بعد میں مسلمانوں نے اس کو دوبارہ تعمیر کیا اور قدیم عمارت کے اینٹ چونے کو کام میں لائے۔

قلعے کے اندر، دروازے کی دوسری جانب، ایک مسجد کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ اس میں ایک دوہرا دالان ہے جو ستون لگا کر دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اندرونی پانچ حصوں کی چھت چھوٹے چھوٹے گنبدوں پر مشتمل ہے۔ بیرونی حصوں کی چھت مخروطی ہے اور اندر سے اس کی شکل ایک ایسے محراب کی ہے جس کے چھ رخ ہیں۔ مسجد کے مشرقی جانب پانچ محراب دار در ہیں۔

ستون مختلف ٹکڑوں پر مشتمل ہیں۔ مربع حصے ایک کے اوپر ایک رکھے ہیں۔

"لوہانی دروازہ"

رام پول دروازے کے برابر پہاڑی کے مغربی کنارے پر لوہانی دروازہ ہے۔ یہ مقبرۂ ہوشنگ کے مغرب میں چند فرلانگ پر واقع ہے جہاں ایک پگڈنڈی جاتی ہے۔ یہ پگڈنڈی وادی کے نشیب اور ان چھوٹے گاؤں کو جاتی ہے جو میدان میں ہیں۔

بیرونی دروازہ جو پہاڑی کی ڈھال پر ہے اس کی محراب گر گئی ہے لیکن فیل پائے درست ہیں۔ راستے کے داہنی جانب دربانوں کے کمروں کے کھنڈر نظر آتے ہیں۔ دروازہ سنگِ سرخ کا بنا ہے۔

ایک فرلانگ کی تین چوتھائی بلندی پر دوسرے دروازے کے کھنڈر ہیں۔ اس عمارت کی اینٹ پتھر پر ہندو طرز کے نقش و نگار بنے ہیں لیکن پہلو کی دیواروں کا طرزِ تعمیر اسلامی ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رام پول دروازے کی طرح یہ دروازہ بھی مسلمانوں نے مانڈو میں اپنی آمد کے بعد ہی سے تعمیر کرایا۔

لوہانی دروازے سے واپس ہوتے ہوئے سیاح پگڈنڈی کی داہنی جانب جنگل میں ایک شکاری مچان دیکھے گا۔ یہ نظارہ شاید اسے شکار پر ابھارے اور آگے وہ ایک ٹیلے کے سامنے سے گزرے گا جس پر دسویں صدی کے ایک ہندو مندر کے کھنڈر ہیں۔ دو فیل پائے جو کسی دروازے کا پتا دیتے ہیں ابھی قائم ہیں۔ ان پر بیحد کندہ کاری کی گئی ہے اور جانور یا پرندے بنٹ پری، دیو وغیرہ کی شکلیں بنی ہیں۔ اس ٹیلے کے سامنے پگڈنڈی کے دوسری جانب، ایک اور ٹیلا ہے جس پر ایک سنگین ستون نظر آتا ہے۔ یہ ستون زمین سے ۱۶ فٹ

بلند ہے۔ نیچے کا حصہ ۴ فٹ کی بلندی تک مربع ہے لیکن اس کے اوپر مثمن ہوجاتا ہے ہر ایک رُخ کی چوڑائی تقریباً ۱۰ انچ ہے۔ بالکل اوپر ایک شکل بھی جو اب مٹ گئی ہے۔

ٹیلے کی پشت پر ایک نالے کی تہ ہے جس میں ایک "شیو" کے ٹکڑے اور کچھ پتھر کی مورتیں پڑی ہیں۔ دونوں ٹیلے اس قابل ہیں کہ ان کو کھودا جائے کیونکہ سطح کے نیچے ممکن ہے کہ کچھ کتبات ایسے ملیں جو مانڈو کی تاریخ پر مسلمانوں کی فتح سے پیشتر روشنی ڈالیں۔

"سات کوٹھری"

وہ لوگ جن کو ہندو آثارِ قدیمہ سے دلچسپی ہے ان کو ایک اور مقام بہت پسند آئے گا اس کا نام سات کوٹھری ہے۔ وہ چٹان کی ڈھال پر مانڈو کے قلعے کے باہر واقع ہے۔ وہاں شاہراہ سے پہنچنے کے لیے اکیسویں میل کے چوتھے فرلانگ پتھر کے نزدیک مڑنا اور جنگل میں ڈیڑھ فرلانگ بجانب مغرب چلنا چاہیے۔ چٹان میں قدرتی چشمہ ہے جس کے چاروں طرف حجرے پتھر کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان کے طول وعرض میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے اور سوائے ایک لنگ اور یونی کے وہاں کندہ کاری یا سنگ تراشی نہیں کی گئی ہے۔

ان حجروں سے وہاں کے قدرتی مناظر بیحد عالی شان نظر آتے ہیں۔ پانی کی موجودگی اور جنگل کا حسن ہی شاید وہ دلکش خوبیاں تھیں جنھوں نے بعض سنیاسیوں کو ایشور کے گیان دھیان کے لیے ان چٹان میں حجرے بنانے کے لیے مجبور کر دیا۔

ان حجروں سے کچھ اوپر ایک کنویں کے نشانات باقی ہیں جن کے نزدیک

ایک دروازہ ہو جس پر کثرت سے نقش و نگار ہیں۔ کچھ پتھر کے چوکھٹ بازو بھی بنے ہیں معلوم ہوتا ہو کہ کسی زمانے میں اس کے قریب کوئی مندر تھا۔

جالی محل (نمبر ۲)

سڑک پر واپس آتے ہوئے سیّاح سات کوٹھری کے دوسری جانب ایک چھوٹا سا مقبرہ دیکھے گا جو ایک ٹیلے پر ہو۔ اس میں کوئی کتبہ نہیں ہو کہ جس سے مدفون کا نام معلوم ہو یا اس کے سال وفات کا پتا چلے۔ طرزِ تعمیر سے یہ پتا چلتا ہو کہ عمارت سولھویں صدی کے آخر میں تیار ہوئی یہ وہ زمانہ ہو جب کہ ہندو اور مسلم صنعتیں مل جل گئی تھیں اور ہندوانی نقش و نگار اسلامی عمارتوں کے مناسب بنائے جانے لگے تھے۔

مقبرہ ایک بلند چبوترے پر بنا ہو اور اس چبوترے سے پچیس سیڑھیاں زیادہ بلند ہو جہاں وہ پگڈنڈی جو سڑک سے نکلی ہو ختم ہو جاتی ہو چبوترے کے اوپر کا حصّہ زیادہ وسیع نہیں ہو۔ یہ ۵۲ فٹ مربع ہو۔ خود مقبرہ بیرونی جانب ۱۹ فٹ ہر ایک طرف ہو اور اندر سے محض ۱۱ فٹ ۱۰ انچ مربع ہو۔ مقبرے کے چاروں طرف ایک محراب ہو۔ شمال کی طرف وہ کھلا ہوا ہو اور باقی تین جانب ان جالیوں سے بند ہو جن پر نازک نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ دو قبریں ہیں جن کے تابوت کسی زمانے میں نہایت خوب صورت ہوں گے لیکن ان کو غارت گرانِ تہذیب نے برباد کر دیا اور اس کے اینٹ پتھّر تک اٹھا لے گئے۔

اس مقبرے کی ایک دل کش خصوصیّت پیلپاؤں کے نکلے ہوئے پہلو ہیں یہ پیلپائے محرابوں کے ہیں اور گو تعمیری اعتبار سے وہ اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ڈاٹیں اُن پر قائم رہیں لیکن آرائش کے لحاظ سے بھی وہ نہایت دل کش ہیں

پیلپاوں کی کرسی پر جو کندہ کاری کی گئی ہی وہ نہایت خوب صورت ہی مقبرے پر ایک خوشنما گنبد ہی۔

اختتام

اب سیاح شادی آباد کو الوداع کہے گا اور اُن ذیشان کھنڈروں اور پُرلطف تفریح گاہوں کے متعلق اپنے تاثرات لے جائے گا لیکن جوشِ مسرت میں یا قنوطی کیفیت کی افسردگی میں اس کو ان خوب صورت عمارتوں کی تعمیر کرنے والوں کے وہ احساسات فراموش نہ کرنا چاہیں جو بڑی سلاستی سے شاہ بداق خاں نے ایک شعر میں ظاہر کیے ہیں۔ یہ شعر نیل کنٹھ پر کندہ ہی ؎

توان کردن تمامی عمر را مصروفِ آب و گِل
کہ شاید یک دمی صاحب دلی ایں جا کند منزل

یہی وہ جذبات ہیں جنھوں نے دنیا میں فنونِ لطیفہ کے زبردست کارنامے پیدا کیے اور انھی تاثرات نے مانڈو کی قدیم عمارتوں کو ہندستانی فنِ تعمیر کا جگمگاتا ہوا ہیرا بنا دیا۔

اشاریہ

مفید عام پریس لاہور میں باہتمام لالہ موتی رام مینیجر چھپی
اور سید صلاح الدین جمالی مینیجر انجمن ترقی اردو (ہند) نے دہلی سے شائع کی۔

عام پسند سلسلہ

اُردو زبان کی اشاعت و ترقی کے لیے بہت دنوں سے یہ ضروری خیال کیا جا رہا تھا کہ سلیس عبارت میں مفید اور دلچسپ کتابیں مختصر حجم اور کم قیمت کی بڑی تعداد میں شایع کی جائیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے اسی ضرورت کے تحت عام پسند سلسلہ شروع کیا ہی اور اس سلسلے کی پہلی کتاب ہماری قومی زبان ہی جو اُردو کے ایک بڑے محسن اور انجمن ترقی اُردو (ہند) کے صدر جناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کی چند تقریروں اور تحریروں پر مشتمل ہی۔ امید ہی کہ یہ سلسلہ واقعی عام پسند ثابت ہوگا اور اُردو کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو کر رہے گی۔ قیمت ۸

ہمارا رسم الخط

از جناب عبد القدوس صاحب ہاشمی

رسم الخط پر علمی بحث کی گئی اور تحقیق و دلیل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہی کہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کے لیے اُردو رسم الخط مناسب ترین اور ضروری ہی۔

گیارہ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر طلب کیجیے۔

منیجر انجمن ترقی اُردو (ہند)، دریا گنج دہلی

۱. یزدانی، غلام۔

۲. ٹائٹل۔

۳. غلاف۔

۴. مانڈو۔ تاریخ

۵. تاریخ شہر۔